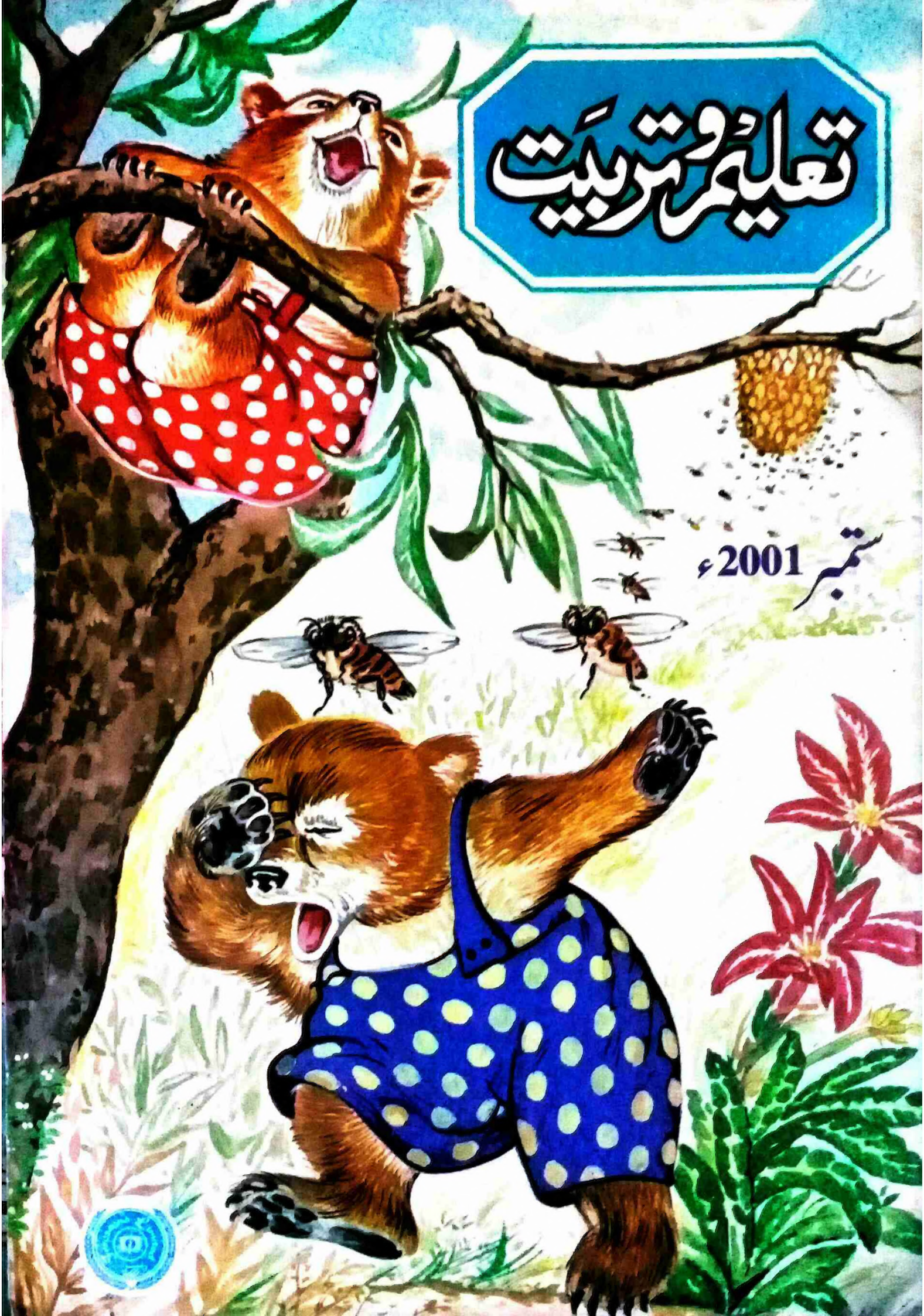

تعلیم و تربیت

ستمبر 2001ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

61واں سال
چھٹا شمارہ

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام
ایڈیٹر/پبلشر: ظہیر سلام
مشیر: سعید لخت
سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر: رضوان ثاقب
خصوصی مشیر: محمود حسن رومی
اسٹریٹیجز/ڈیزائننگ: شوکت اعجاز
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

بگھی کا راز

کیا آپ کسی ایسی بگھی کے بارے میں جانتے ہیں جس میں سواریاں کھچا کھچ بھری ہوں اور اس کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے ہوں مگر کوچوان غائب ہو؟ اس سے بھی حیرت کی بات یہ کہ گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کے باوجود بگھی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرکتی ہو۔ اس طلسماتی بگھی کے بارے دیگر حیرت انگیز اور ناقابل یقین معلومات آپ کو رضوانہ سید علی اگلے ماہ بتائیں گی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

ہمارا 54واں یوم آزادی گزر چکا اور ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ ساتھیوں نے جشن آزادی ہمارے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق منایا۔ امید ہے آیندہ بھی یہ طریقہ یاد رکھیں گے اور اگلے سال 55واں یوم آزادی بھی اسی طرح منائیں گے۔ کسی قوم کی شناخت اس کے خوشی اور غمی کے تہواروں سے ہی تو ہوتی ہے اس لیے ہمیں اپنے تہوار نہایت شائستہ اور مہذبانہ طریقے سے منانے چاہئیں۔ اس ماہ کی 6 تاریخ کو ایک اور قومی تہوار یوم دفاع بھی تو آرہا ہے۔ اس روز آج سے 35 سال پہلے ہمارے دشمن ملک بھارت نے ہماری سرحدوں پر حملہ کردیا تھا مگر ہماری بہادر فوجوں نے اسے عبرت ناک شکست دی تھی۔ اس دن کو پتنگ بازی یا اسی طرح کی دیگر ہندووانہ رسموں میں گزار دینا کتنی بری بات ہے۔ ہمیں تو اس روز اس بات کا عہد کرنا چاہیے کہ ہم اپنے دشمن ملک کے ساتھ ہر محاذ پر جنگ لڑنے کے لیے تیار رہیں گے' اس کی غیر اخلاقی اور غیر اسلامی رسومات کا مکمل بائیکاٹ کریں گے۔ اس کی ثقافت کو اپنے ملک سے دیس نکالا دیں گے۔

اسی مہینے کی 11 تاریخ کو ایک غم کا تہوار بھی ہے یعنی اس روز ہمارے محبوب قائداعظم بانی پاکستان محمد علی جناح ہم سے جدا ہوئے تھے۔ اس روز ہم سب کو خلوص دل سے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پاکستانی قوم کے اس عظیم محسن کو جنت میں اونچا مقام عطا فرمائے اور ہمارے جذبوں کو اس ملک کے تحفظ اور ترقی کے لیے ہمیشہ جوان رکھے۔

آپ کے اسکول کھل چکے ہوں گے اور تعلیمی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہوں گی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا اصل مقصد تو گرمی اور لو سے بچنا ہوتا ہے لیکن اس مرتبہ اللہ کا خاص کرم یہ ہوا کہ برسات کا موسم قبل از وقت شروع ہو جانے سے جھلسا دینے والی گرمی نہیں پڑی البتہ کچھ علاقوں میں بارش کی زیادتی کی وجہ سے بارش کے پانی نے تباہی مچا دی ہے۔ ان علاقوں کے عوام ہمدردی کے مستحق ہیں۔ اسکول کھلتے ہی اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں ان کی امداد کے لیے کچھ نہ کچھ عملی اقدامات ضرور کریں۔ ایڈیٹر۔

ستمبر 2001ء

سرورق: ٹوٹو نے شہد کھایا

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

قیمت فی پرچہ: 15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

اس شمارے میں

[illegible]	[illegible]	2
[illegible]	[illegible]	3
[illegible]	[illegible]	5
[illegible]	[illegible]	8
[illegible]	[illegible]	12
[illegible]	[illegible]	18
[illegible]	[illegible]	22
[illegible]	[illegible]	24
[illegible]	[illegible]	25
[illegible]	[illegible]	26
[illegible]	[illegible]	28
[illegible]	[illegible]	29
[illegible]	[illegible]	32
[illegible]	[illegible]	34
(سائنس فکشن) [illegible]	حسن ذکی کاظمی	37
[illegible] (کہانی)	محمد ادریس قریشی	48
آیئے مسکرائیں (لطائف)		55
[illegible] (کہانی)	[illegible]	56
[illegible] (کہانی)	اشتیاق احمد	60
[illegible]		64
[illegible]		

سالانہ قیمت: پاکستان میں (بمعہ رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/750 روپے سالانہ
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/830 روپے سالانہ
امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/950 روپے سالانہ
پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310

جہادِ ستمبر (1965) کا سبق

حفیظ الرحمان احسن

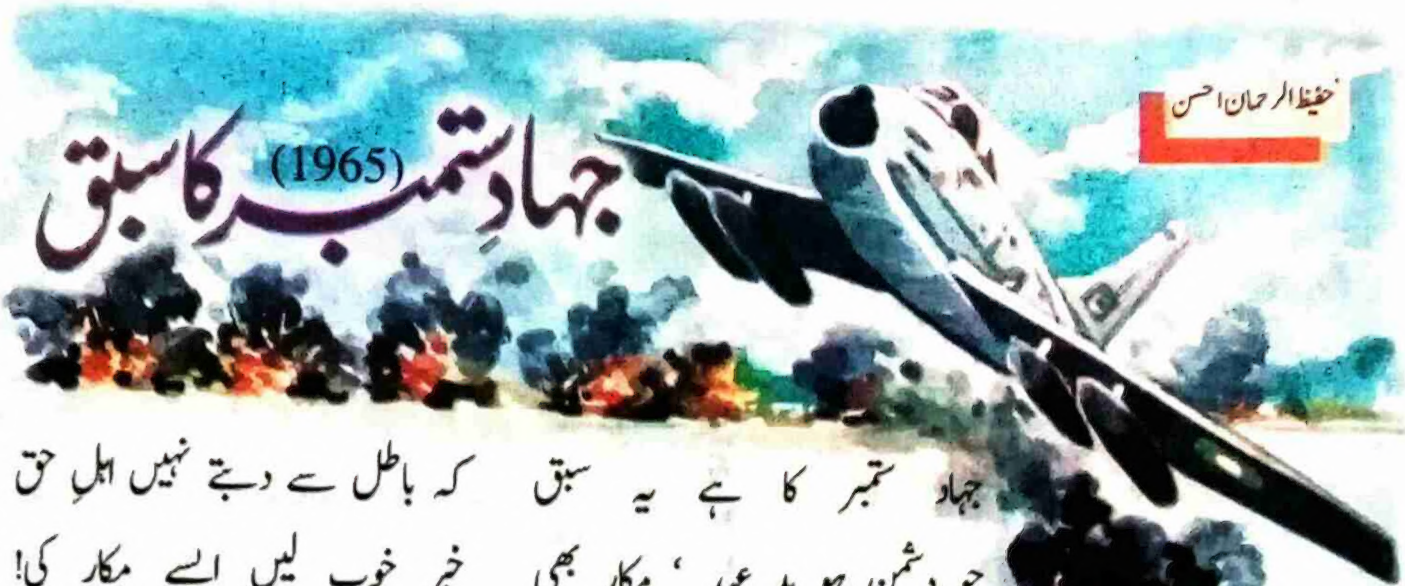

جہاد ستمبر کا ہے یہ سبق
کہ باطل سے دبتے نہیں اہلِ حق

جو دشمن ہو بد عہد ' مکار بھی
خبر خوب لیں ایسے مکار کی!

جو سرحد کی جانب بڑھائے قدم
تو خود بڑھ کے کر دیں سر اس کا قلم

مجاہد کی دیکھو عجب شان ہے
ہتھیلی پہ رکھے ہوئے جان ہے

وہ لڑتا ہے رب کی رضا کے لئے
ہے اس کی ہر اک شے خدا کے لئے

شہادت تو مومن کو محبوب ہے
شہادت ہی غازی کو مطلوب ہے

یہ لازم ہے ہم پر ' رہیں ہوشیار
نہ کر پائے دشمن کبھی ہم پہ وار

حفاظت کریں سرحد پاک کی
حفاظت ' وطن کی حسیں خاک کی

خدا کی امانت ہے یہ سرزمیں
کوئی بڑھ کے محبوب اس سے نہیں

اگر پھر کبھی آیا دشمن ادھر
تو لیں گے ہم اس کی کچھ ایسی خبر

اسے الٹے قدموں بھگا دیں گے ہم
مجاہد ہیں ہم ' جاں لڑا دیں گے ہم

فلک پر بھی گونجے گی پھر ایک لے:
"محبت مجھے ان جوانوں سے ہے،

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند"
خدا کو ہیں ان کے عزائم[1] پسند

رہیں گے وہ ہر حال میں ارجمند[2]
رکھیں گے وہ ملت کا پرچم بلند

جہاد ستمبر کا ہے یہ سبق
لکھیں اپنی قسمت کا روشن ورق

ہمیں چھ ستمبر کا دن یاد ہے
دل اس کے تصور سے ہی شاد ہے!

[1] عزائم : ارادے
[2] ارجمند : کامیاب۔ خوش نصیب

ٹوٹو نے شہد کھالیا

فوزیہ عباس

"ٹوٹو' لارا...... کہاں ہو...... گھر آؤ کھانا تیار ہے" ماما بئیر فلورا نے گھر کے دروازے میں سے باہر جھانکتے ہوئے اپنے دونوں بچوں کو آواز دی جو بارش میں اس وقت دوسرے بچوں کے ساتھ کہیں کھیل کود میں مشغول تھے۔

"لگتا ہے دونوں کہیں دور نکل گئے ہیں" کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد فلورا نے سوچا اور دروازے کے قریب رکھی چھتری اٹھا کر باہر نکل آئی جہاں موسلادھار بارش کی وجہ سے خوب جل تھل ہو رہا تھا' پیڑ پودے دھل کر خوب نکھر آئے تھے' فلورا نے زور سے ایک لمبا سانس لیا۔ ٹھنڈی ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوش بو کے ساتھ پھولوں کی مہک اور جنگل کی مخصوص خوش بو بھی شامل تھی۔

جنگل کے تمام مکین تو اپنے اپنے گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند کئے اندر دبکے ہوئے تھے مگر ان کے گھروں کی چمنیوں سے نکلنے والی طرح طرح کے مزے دار کھانوں کی خوش بو نے اس کی بھوک چمکا دی تھی۔ آج فلورا نے بھی موسم کی مناسبت سے کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا مگر دونوں نالائق بچے بارش میں نہانے کے شوق میں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

"ارے فلورا سنو...... ایک منٹ ذرا رکو" فلورا ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے سے اپنا لمبا سا اسکرٹ سنبھالے پانی میں شڑپ شڑپ کرتی چلی جا رہی تھی کہ کسی نے اسے پکارا۔

فلورا نے رک کر دیکھا۔ اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانکتی یہ مسز ڈینی تھی' ایک نازک مزاج ہرنی۔

"فلورا' تم شاید اپنے بچوں کو لینے جا رہی ہو' پلیز اگر میرا نونی کہیں نظر آئے تو اسے بھی ساتھ لے آنا"۔

"میں اسے کہاں ڈھونڈوں گی' ایسا کرو تم بھی میرے ساتھ چلو" فلورا کو مسز ڈینی کا بے وقت روکنا برا لگا۔

"نہیں فلورا بارش میں بھیگنے سے مجھے زکام ہو جاتا ہے' تم ہی اسے لے آنا" مسز ڈینی نے کہا تو فلورا مزید کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ گئی' ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ دیکھا' سامنے سے ننھا ڈوڈی سونڈ اٹھائے بڑے بڑے کان کھڑے کئے روتا چنگھاڑتا دوڑتا چلا آرہا ہے۔

"ڈوڈی بیٹا کیا ہوا تم کیوں رو رہے ہو؟" قریب پہنچ کر فلورا نے اس سے پوچھا۔

"آنٹی گینڈے کے بچے جیک نے مجھے دھکا دے کر گرایا ہے"۔

"بیٹا کھیل میں اس طرح تو ہو جاتا ہے" بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے" فلورا نے پیار سے سمجھایا۔

"نہیں" ڈوڈی زور سے چنگھاڑا "جیک بہت گندا ہے۔ اس نے مجھے جان بوجھ کر دھکا دیا تھا' دیکھیں میرا گھٹنا بھی زخمی ہو گیا ہے" ڈوڈی اپنا دایاں گھٹنا دکھاتے ہوئے بولا جس پر گرنے کی وجہ سے کچھ خراشیں پڑ گئی تھیں۔

"تم سب کہاں کھیل رہے ہو؟"

"ادھر تالاب کے پاس" ڈوڈی نے سونڈ لہرا کر تالاب کی جانب اشارہ کیا تو فلورا جلدی سے ادھر چل پڑی تاکہ مایا کے آنے سے پہلے پہلے اپنے بچوں کو لے کر گھر چلی جائے۔ ڈوڈی کی ماں' مایا بے حد لڑاکا قسم کی ہتھنی تھی جو ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیا کرتی تھی' اب بھی ڈوڈی کا زخمی گھٹنا دیکھ کر یقیناً وہ غصے سے تن فن لڑنے پہنچ جائے گی۔

"شکر ہے ڈوڈی ٹوٹو کے دھکے سے نہیں گرا" فلورا نے خوف سے جھرجھری لی۔

تالاب کے قریب پہنچنے پر اسے بہت سارے بچوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا' لارا اور ننھی بندریا مومو پینگوں پر بیٹھی تھیں جب کہ ٹوٹو باقی بچوں کے ساتھ ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہا تھا' ٹوٹو اور لارا کی عمریں تین تین ماہ تھیں اور باقی بہت سے بچوں کی طرح وہ بھی پہلی مرتبہ بارش کا مزہ لے رہے تھے۔ اسی لیے تو بہت خوش تھے۔ کبھی ایک دوسرے پر پانی اچھالتے تو کبھی زمین پر لوٹنے لگتے' فلورا کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر آواز دے کر بولی۔

"ٹوٹو' لارا بس اب کھیل ختم کرو اور گھر چلو..... نونی تم بھی چلو تمہاری امی بلا رہی ہیں"

یہ سنتے ہی تینوں بچے کھیل چھوڑ کر فلورا کے پیچھے چل پڑے' راستہ بھر تینوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور اٹکھیلیاں کرتے رہے' اچانک زور سے بجلی چمکی تو ٹوٹو اور لارا ڈر کر ماں سے چپک گئے' نونی کا گھر قریب آ گیا تھا۔ وہ قلانچیں بھرتا ادھر دوڑ گیا' مسز ڈینی ابھی تک کھڑکی میں کھڑی تھی۔

گھر پہنچ کر فلورا نے دونوں بچوں کے جلدی سے کپڑے بدل کر کھانے کے لیے بیٹھنے کو کہا اور خود کچن میں چلی گئی مگر ٹوٹو اور لارا تو اپنے پاپا کو بارش میں نہانے کے دلچسپ تجربے کے بارے میں بتانا چاہتے تھے' اس لیے ماں کی بات سنی ان سنی کر گئے۔

بھاری بھرکم پاپا بیئر اس وقت مزے سے آرام کرسی پر بیٹھے منہ میں پائپ دبائے کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے'

جب ٹوٹو اور لارا ان کی کرسی کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر جلدی جلدی سب کچھ بتانے لگے تو وہ کتاب بند کر کے ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"آچھی" بولتے بولتے اچانک لارا کو زور سے چھینک آئی "آچھی..... آآچھی" پھر دوسری اور تیسری۔

"خبردار کوئی نہیں چھینکے گا" پاپا نے پائپ منہ سے نکال

کر کہا۔

"جی اچھا..... چھی" لارا نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے "جی اچھا" کہنا چاہا مگر اسی وقت ایک اور چھینک آگئی تو اچھا اور چھینک کی آواز گڈمڈ ہو گئی۔ لارا نے جھٹ منہ پر ہاتھ رکھ لیا تو ٹوٹو اور پاپا ہنسنے لگے۔

"اچھا بھئی باقی باتیں اب کھانے کے دوران میں ہوں گی۔ تم لوگ جلدی سے کپڑے بدل لو ورنہ تمہاری ماما نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گی..... چلو جاؤ شاباش" پاپا نے دونوں کو بھگایا اور خود اٹھ کر کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔

"داؤ میری پسندیدہ ٹونا مچھلی"

"اور میری پسند کا جھینگوں کا شوربا"

جب ٹوٹو نیکر اور لارا فراک بدل کر آئے تو میز پر اپنی پسند کی چیزیں دیکھ کر دونوں خوش ہو گئے۔

"فلورا امی جان کو یہ مچھلی بہت پسند ہے ان کے لیے کچھ بھجوا دینا" پاپا نے ایک مچھلی اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' میں نے ان کا حصہ پہلے ہی الگ کر دیا ہے۔ کل بھجوا دوں گی" فلورا نے شوربا پیتے ہوئے جواب دیا۔

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ نونی پھر ٹوٹو کو بلانے آگیا مگر فلورا نے بچوں کو دوبارہ بارش میں نہانے سے منع کر دیا۔

"کہیں ان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے" یہی سوچ کر فلورا نے انہیں رات کو گرم دودھ میں شہد ڈال کر دیا تاکہ اس کی گرم تاثیر سے ان کے اندر ٹھنڈ کا اثر ختم ہو جائے۔

اگلا دن بے حد روشن تھا' بارش رک گئی تھی اور جنگل کے تمام مکین اپنی روزمرہ کی مصروفیات شروع کر چکے تھے۔ فلورا نے دونوں بچوں کو ناشتا کرایا پھر انہیں ایک ٹوکری میں چار مچھلیاں رکھ کر دیں کہ دادی جان کو دے آئیں۔ دونوں نے ٹوکری اٹھائی اور دادی جان کے گھر کی جانب چل پڑے جو ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتی تھیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا' دادی جان سر پر اسکارف پہنے ایک بڑی سی ٹوکری بازو میں ڈالے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوسرے راستے سے اپنے گھر کی جانب چلی آرہی ہیں۔ ٹوٹو اور لارا دوڑ کر دادی جان سے لپٹ گئے۔ وہ بھی بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے جھک کر دونوں کو پیار کیا۔ تب ٹوٹو نے دادی جان سے پھلوں سے بھری ٹوکری جس میں لال لال رس بھری' بڑے بڑے سیب اور موٹی موٹی ناشپاتیاں وغیرہ رکھی تھیں لے لی اور لارا نے دادی جان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھر پہنچ کر انہوں نے دادی جان کو مچھلیوں والی ٹوکری دی تو وہ اور بھی زیادہ خوش ہوئیں۔ پھر دادی جان نے دونوں بچوں کو اپنے ہاتھ کے بنے پین کیک اور تازہ پھل کھانے کو دیئے۔

"دادی جان یہ کیک تو بہت مزے کے ہیں اور ان میں سے بالکل ویسی ہی خوش بو آرہی ہے جیسی رات کو دودھ میں سے آرہی تھی..... ہیں ناں لارا"۔

جب دادی جان دونوں کے لیے جوس لے کر آئیں تو ٹوٹو نے اپنی پلیٹ میں رکھے ادھ کھائے کیک پر انگلی پھیر کر چاٹتے ہوئے کہا۔

"دادی جان آپ نے کیک کے اوپر میٹھی میٹھی یہ کیا چیز لگائی ہے؟" لارا نے پوچھا۔

اصل میں دونوں ابھی شہد کے نام اور ذائقے سے ناواقف تھے اور کل رات کو انہوں نے پہلی مرتبہ شہد ملا دودھ پیا تھا۔ اس وقت بھی ٹوٹو نے کیک پر لگے شہد کو اس کی خوش بو سے پہچانا تھا۔

"لارا میری جان! یہ میٹھی خوش بو دار چیز شہد ہے" دادی جان نے محبت سے لارا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"دادی جان، مجھے شہد بہت اچھا لگا ہے لیکن ماما نے اس کو دودھ میں ڈالا تھا اور آپ نے کیک پر لگا کر دیا ہے۔ کیا ہم اس کو ویسے نہیں کھا سکتے؟"

ٹوٹو نے پلیٹ میں لگے قطروں کو چاٹتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل کھا سکتے ہیں، لیکن دوسری چیزوں کے ساتھ ملانے سے اس کی غذائیت بڑھ جاتی ہے اور بچوں کو تو ہمیشہ ایسی ہی چیزیں کھانی چاہئیں جو مزے کے ساتھ ساتھ طاقت و توانائی سے بھرپور ہوں"۔

ٹوٹو نے ان باتوں کو ذہن میں بٹھالیا۔ دن بھر دادی جان کے پاس گزار کر شام کو جب وہ دونوں گھر واپس جانے لگے تو دادی جان نے ٹوٹو کو شہد سے بھری ایک بوتل دی اور تاکید کی کہ اسے گھر لے جا کر اپنی ماما کو دینا۔ شہد کی بوتل کے ساتھ احتیاط کی ہدایت ٹوٹو کو کچھ اچھی نہیں لگی اور گھر پہنچنے تک اس نے بوتل آدھی ختم کر دی، لارا اسے منع کرتی تو وہ بوتل میں انگلی ڈبو کر اسے بھی کچھ شہد چٹا دیتا تھا تاکہ وہ گھر جا کر ماما سے شکایت نہ لگا سکے، یوں بوتل لے کر فلورا کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس میں شہد کتنا تھا۔

جب تک باقی کی آدھی بوتل بھی ختم نہیں ہو گئی ٹوٹو کو چین نہیں آیا۔ وہ آتے جاتے شہد کھانے کی ضد کرتا، فلورا منع کرتی تو کہتا "دادی جان نے کہا تھا کہ بچوں کو شہد ضرور کھانا چاہیے"۔

کبھی کہتا "ماما دودھ میں شہد ڈال کر پینے سے زیادہ طاقت آتی ہے، کیا آپ نہیں چاہتیں کہ میں جلدی سے بڑا ہو جاؤں"۔ یوں بہانے بہانے سے ایک ہفتے میں ہی اس نے سارا شہد ختم کر ڈالا۔

ایک دن ٹوٹو تالاب میں تیر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دوسرے کنارے پر آگے ایک بڑے سے درخت پر لگے شہد کے چھتے پر پڑی، ٹوٹو کو شہد کھائے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ اتنا بہت سارا شہد دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ گیا اور وہ نہانا چھوڑ کر دوسرے کنارے کی طرف چل پڑا، جنگل کے اس حصے میں ٹوٹو پہلی مرتبہ آیا تھا اور وہ بھی تنہا۔ پہلے تو اسے ڈر لگا لیکن پھر شہد کھانے کے شوق میں وہ سب بھول بھال کر درخت پر چڑھ گیا، ادھر ادھر دیکھ کر اس نے مکھیوں کی غیر موجودگی کا یقین کیا اور پھر مزے سے شہد نکال کر کھانے لگا۔ شہد کھانے کے بعد ٹوٹو درخت سے اترا اور اسی راستے سے گھر لوٹ گیا۔ اس دن کے بعد سے تو ٹوٹو کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر روز دوپہر میں جس وقت مکھیاں چھتے میں موجود نہ ہوتیں، آتا اور کچھ شہد کھا کر واپس چلا جاتا۔ ادھر مکھیوں سے شہد غائب ہونے کی بات بھلا کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ حیران بھی تھیں اور پریشان بھی کہ آخر دن بھر کی محنت سے پھولوں کا رس اکٹھا کرنے اور مسلسل شہد بنانے کے باوجود چھتے میں شہد کی مقدار روز بروز کم کیوں ہو رہی ہے؟

"آج تک اس علاقے میں کسی کو میری اجازت کے بغیر ایک قطرہ شہد لینے کی بھی ہمت نہیں ہوئی تھی"۔ ملکہ مکھی نے اپنے چھتے کی سب مکھیوں کو جمع کر کے کہا۔ "لیکن اب ایسا ہو رہا ہے۔ کوئی ہماری غیر موجودگی میں نہایت ہوشیاری سے تھوڑا تھوڑا شہد ہر روز غائب کر رہا ہے جس کا پتا لگانا ضروری ہے۔ اس لیے کل سے کچھ مکھیاں چھپ کر چھتے کی نگرانی کریں گی"۔

اگلے دن بھی ٹوٹو حسب معمول اچھلتا کودتا آیا اور درخت پر چڑھ کر مزے سے کچھ شہد کھا کر لوٹ گیا۔ شام کو نگران مکھیوں نے ملکہ کو ٹوٹو کے بارے میں بتایا۔

"کل ہم سب پھولوں کا رس لینے نہیں جائیں گی بلکہ چھپ کر ریچھ کے اس نالائق بچے کا انتظار کریں گی جو ہماری اجازت کے بغیر شہد چرا رہا ہے" ملکہ نے فیصلہ سنایا۔

ادھر ٹوٹو صاحب کو بھی روز تھوڑا تھوڑا شہد کھانے میں

مزہ نہیں آرہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ کسی دن پورا چھتہ اتار کر ایک ہی بار خوب جی بھر کر شہد کھائے' بس یہی سوچ کر دوسرے دن ٹوٹو نے پورا چھتا اتار لیا..... مگر یہ کیا چھتے کو اتارتے ہی ادھر ادھر چھپی ہوئی مکھیاں ملکہ کے اشارے پر بھن بھن کرتی نکلیں اور ٹوٹو پر ٹوٹ پڑیں' بے چارہ ٹوٹو اس ناگہانی آفت سے بوکھلا گیا۔ وہ تو آج تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ مکھیوں کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ اب جو ہر طرف سے مکھیوں کے سوئیوں جیسے ڈنک اس کے جسم میں چبھنے لگے تو وہ ہاتھ پاؤں مار کر ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے درخت پر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چھتے سمیت دھڑام سے زمین پر آرہا۔ سارا شہد اس کے کپڑوں اور زمین پر گر گیا۔ مکھیاں اپنے دن رات کی محنت سے بنائے ہوئے قیمتی شہد کے ضائع ہونے پہ اور بھی بھنائیں اور پلٹ پلٹ کر ٹوٹو کو ڈنک مارنے لگیں تو وہ چیختا چلاتا گھر کی جانب دوڑا۔ مکھیاں بھی اس کے پیچھے ہی گھر تک پہنچیں' شور کی آواز سن کر فلورا گھر سے نکلی اور ساری بات جان کر اس نے ملکہ مکھی سے ٹوٹو کی اس غیر اخلاقی حرکت پر معافی مانگی۔ تب جا کر کہیں ٹوٹو کی جان چھوٹی۔

شام تک ٹوٹو کا سارا جسم سوج گیا' مارے درد اور جلن کے اسے کسی کروٹ چین نہیں آرہا تھا۔ یہاں تک کہ گھاس کا نرم بستر بھی اسے کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا' لارا اور ٹوٹو کے سب دوست جیک' نونی اور ڈوڈی وغیرہ تو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ کبھی اس کی پکوڑا بنی ناک کا مذاق اڑاتے تو کبھی سوجے ہوئے ہونٹوں کا۔

"اور کھاؤ چھپ چھپ کر شہد' مزہ آیا ناں" لارا بار بار اسے چڑاتی۔

ننھی بندریا موموکی ممی لالی ڈاکٹر تھی۔ پاپا جلدی سے اسے بلا لائے جس نے مختلف جڑی بوٹیاں پیس کر ٹوٹو کے جسم پر ملیں اور پٹیاں لپیٹ دیں جس سے دو دن کے بعد ٹوٹو آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا اور پھر اسی روز شام کو ملکہ مکھی دوبارہ ان کے گھر آئی' ٹوٹو نے اسے دیکھتے ہی ڈر کر سر تک چادر تان لی تو ملکہ نے آگے بڑھ کر اس کے سر سے چادر اتاری' اس کے اشارے پر چار مکھیوں نے ایک خوب صورت ٹوکری ٹوٹو کی جانب بڑھائی جس میں ڈھیر سارے پھولوں کے درمیان میں شہد کا ایک چھوٹا سا چھتا رکھا تھا۔

"ٹوٹو تمہیں بغیر اجازت شہد کھانے کی سزا مل گئی ہے۔ چوں کہ تم ایک چھوٹے بچے ہو اور تمہیں شہد کھانا پسند ہے اس لیے ہم سب نے دو دن کی محنت سے تمہارے لیے یہ شہد تیار کیا ہے۔ وعدہ کرو آئندہ کبھی بھی پوچھے بغیر کسی کی کوئی چیز نہیں لو گے" ٹوٹو نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے ٹوکری تھام لی۔

سید نظر زیدی

قائدِ اعظمؒ زندہ باد

پاکستان بنانے والے قائداعظمؒ زندہ باد !

قوم کی شان بڑھانے والے قائداعظمؒ زندہ باد!

مشکل میں تھے ہند کے مسلم آپ نے ہر مشکل سے نکالا

آپ کی ہمت اور کوشش سے آج ہمارا بول ہے بالا

بن گئے مالک پاک وطن کے، گھر گھر آزادی کا اجالا

رحمت بن کر آنے والے قائداعظمؒ زندہ باد !

پاکستان بنانے والے قائداعظمؒ زندہ باد !

قائداعظمؒ آپ کے صدقے یہ عزت اور شان ملی ہے

پاکستانی کہلاتے ہیں، یہ اچھی پہچان ملی ہے

طوفانوں سے ٹکرانے کی غیرت، ہمت، آن ملی ہے

سیدھی راہ دکھانے والے، قائداعظمؒ زندہ باد !

پاکستان بنانے والے قائداعظمؒ زندہ باد !

اونچائی پر لہراتا ہے چاند ستارے والا پرچم

یہ پرچم ہے پاک وطن اور ملت کا رکھوالا پرچم

اپنے پاکیزہ وصفوں میں یہ ہے سب سے بالا پرچم

یہ پرچم لہرانے والے، قائداعظمؒ زندہ باد !

پاکستان بنانے والے قائداعظمؒ زندہ باد !

قوم کی شان بڑھانے والے قائداعظمؒ زندہ باد!

قائدِ اعظمؒ سے انٹرویو

فریدہ گوہر

اسلم اپنی کوٹھی کے لان میں اپنی ڈائری لیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے محمد علی جناح اپنے مخصوص محتاط انداز میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ اسلم نے وڈیو کیمرا اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا اور کیمرے کے عین سامنے آکر یوں سامعین سے مخاطب ہوا۔

"معزز سامعین السلام علیکم! آپ کا اسلم اپنے پروگرام "انٹرویو" کے ساتھ حاضر خدمت ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس پروگرام میں ملک کی مایہ ناز شخصیتوں کو بلا کر انٹرویو کیا جاتا ہے۔ یہ خاص بچوں کا پروگرام ہے جو آج اور مستقبل میں زندہ ہیں، جن کی جڑیں ماضی سے پیوستہ ہیں۔

آج جس معزز شخصیت سے میں آپ کو ملوانے جا رہا ہوں یقیناً آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ وہ ہیں جناب قائداعظم محمد علی جناح۔

(تالیوں کی بے تحاشا آواز)

اسلم (ہاتھ ملاتے ہوئے): السلام علیکم محمد علی جناح آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ۔

قائداعظم محمد علی جناح نے سر کو ہلکے سے جنبش دی اور مسکرا کر دایاں ہاتھ پیشانی تک لے گئے۔ ایک بار پھر تالیوں سے ماحول گونج اٹھا۔

اسلم: اچھا تو محمد علی جناح آپ کا پورا نام ہے۔ قائداعظم آپ کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ نے آزادی سے پہلے مسلمانوں کی قیادت کی تھی۔ قائداعظم کا مطلب ہے بہت بڑا لیڈر۔

محمد علی جناح: بالکل صحیح۔

اسلم: اور آپ کو پاکستان سے بہت پیار ہے۔

محمد علی جناح: ہاں مجھے پاکستان سے بہت پیار ہے کیوں کہ پاکستان صرف پاک لوگوں کے رہنے کی ایک جگہ کا نام ہی نہیں بلکہ یہ ایک نظریہ کا نام بھی ہے۔

اسلم (قدرے حیران ہو کر): نظریہ؟ کیسا؟

محمد علی جناح: ہاں پاکستان ایک نظریہ ہے' پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ کا نظریہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ پاک لوگ کون ہوتے ہیں؟

اسلم (سر نفی میں ہلاتے ہوئے): نہیں۔

محمد علی جناح: پاک لوگ وہ ہوتے ہیں جو متقی ہوتے ہیں۔ پرہیز گار اور نیک عمل کرنے والے لوگ۔ ایسے لوگوں کی موجودگی دوسرے انسانوں کے لیے راحت کا باعث بنتی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔

اسلم: مگر سر! یہاں پر تو بہت برے لوگ رہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ قتل و غارت کی خبروں سے اخبار بھرے پڑے ہیں۔ باپ کو بیٹے سے پیار نہیں' بیٹا باپ کا ادب نہیں کرتا۔ بیٹیاں بد تمیز ہیں۔ بھائی بہن ایک دوسرے سے بہت دور ہو رہے ہیں۔ ایک بم کے دھماکے سے بہت سے بے گناہ شہری چند پیسوں کے عوض ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ ہے؟

(شدت جذبات سے اسلم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا)

محمد علی جناح: ہاں ایسے لوگ بھی پاکستان میں رہتے ہیں۔ وہ دراصل اپنے نظریے کو بھول گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے نظریہ کو نہیں پہنچانتے۔ وہ ان پڑھ ہیں' بے تربیت ہیں۔ انہیں تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ پہلے تو لوگ نظریہ پاکستان کو اتنی شدت سے نہیں پہچانتے تھے مگر اب پاکستان کے خاص طور پر بچے نظریہ پاکستان کو پہنچانتے ہیں' اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

اسلم: تعلیم و تربیت دینا تو اساتذہ کا کام ہے۔ وہ نظریہ پاکستان سمجھائیں اور خود بھی سمجھیں۔

محمد علی جناح: بے شک تعلیم و تربیت دینا اساتذہ کا کام ہے اور میں ان سے ناامید نہیں ہوں۔

اسلم (مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے): نہیں سر! مجھے تو نظر نہیں آتا کہ اساتذہ خلوص سے نظریہ پاکستان سمجھنے اور سمجھانے لگے ہیں۔ (دبے لفظوں میں)۔ اساتذہ کرام خود بھی اس ضروری علم سے نابلد ہیں۔ معاف کیجئے گا' ٹیوشن پڑھا پڑھا کر وہ تو بس پیسا کمانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

(کہنے کو تو اس نے اتنی بڑی بات کہہ دی پھر خجل سا ہو کر سر کھجانے لگا)

محمد علی جناح (مسکراتے ہوئے): ہاں! ایک استاد ہے جو تعلیم بیچ کر اپنا پیٹ پالتا ہے مگر سب استاد ایک جیسے نہیں ہوتے بیٹے' یاد رکھو پاکستان کا ہر فرد مرد ہو یا عورت' بچہ ہو یا بوڑھا' استاد ہے۔

اسلم (چونکتے ہوئے): وہ کیسے؟

محمد علی جناح: میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کے قیام کی وجوہ کیا تھیں اور آج یہ کس دور سے گزر رہا ہے' ہر پاکستانی شہری اس پر غور کرے۔ اس سلسلے کی مستند کتابیں پڑھے اور پھر اس کو سمجھ کر دوسروں کو سمجھائے..... اس طرح ہر فرد استاد ہوا کہ نہیں۔

اسلم (سر ہلاتے ہوئے): ہاں یہ تو بات ہے۔ اگر کوئی بچہ کسی دوسرے بچے کو کچھ سکھاتا ہے تو وہ اس کا استاد ہوا۔ اور کبھی کبھی تو بچے بڑوں کو کچھ علم دینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ علم تو ایک مسلسل عمل کا نام ہے جو انسانوں کو صحت مند معاشرہ بنانے کی تربیت دے رہا ہوتا ہے۔ اس میں نبی نوع انسان کی بقا ہے۔

محمد علی جناح (خوش ہو کر): ہاں یہ تو ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ پاکستان میں استادوں نے کیسے کیسے نوجوان پیدا کئے ہیں۔

اسلم:۔ نہیں میں اندازہ نہیں کر سکتا' آپ ہی بتائیں۔

محمد علی جناح: ڈاکٹر قدیر کو دیکھ لو' اس نے محدود وسائل میں پاکستان کو ایٹمی طاقت بنا دیا۔ اس پاکستانی بچے نے یہ کارنامہ انجام دے کر پاکستان کی طرف اٹھنے والی ہر میلی آنکھ کو جھکا دیا ہے۔

اسلم: آپ نے درست فرمایا۔ باطل کو مٹانے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ حق دیکھنے میں بھی طاقت ور نظر آئے۔

محمد علی جناح: میجر عزیز بھٹی کو دیکھ لو' ملک کی سرحدوں پر لڑتے لڑتے جان دے دی مگر دشمن کو سرحد پار نہیں کرنے

دی۔ راشد منہاس جیسا بچہ جو اڑتے جہاز میں دشمن سے لپٹ گیا اور اہم راز کی چوری بچانے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ حکم محمد سعید جیسا دلیر پاکستانی بچہ جسمانی بیماریوں کے علاوہ روحانی بیماریوں کا علاج کرتے کرتے اسلام دشمن عناصر کا شکار تو ہو گیا مگر ہتھیار نہیں ڈالے۔

اور وہ پاکستانی بچے جو جہالت سے لڑائی لڑنے میں مصروف ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے اسکولوں سے لے کر بڑی بڑی یونی ورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں۔ یہ ڈاکٹرز' انجینئرز' شاعر و ادیب' تاجر' کسان' ریسرچ میں مصروف سائنس دان سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ مصروف ہیں حتیٰ کہ پاکستان کی بچی آپ کی دادی اماں بھی تو کم زور و ناتواں ہونے کے باوجود نماز کے بعد خدا سے پاکستان کے لیے دعا کرتی ہیں اور ننھے پوتے کو کھلاتی ہیں کہ وہ بڑا ہو کر پاکستان کے لیے کام کرے گا۔

اسلم (دل چسپی سے): ہاں مگر سر! یہ کام تو ہر کوئی اپنے اپنے ملک میں کر رہا ہے' پاکستان میں منفرد بات تو کچھ بھی نہیں۔

محمد علی جناح (مسکراتے ہوئے پہلو بدلتے ہیں): پاکستان میں مقیم مجاہد خواہ وہ سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں یا جہالت سے برسرپیکار ہیں' بدی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں یا انسانیت کی حفاظت میں لڑ رہے ہیں سب کا ایک نظریہ ہے۔ وہ ہے "نظریہ پاکستان کی حفاظت اور اس کی ترویج۔" اس کے لیے وہ شیر خاں کی طرح دشمنوں سے گتھم گتھا ہو جائے تو وہ دنیا کے دوسرے عام انسانوں سے مختلف ہو جائے گا۔

اسلم: ہاں یہ تو ہے۔

محمد علی جناح: میں پاکستان کے نوجوانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ (ان کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی)

اسلم: آخر میں ایک سوال' آپ مجھے اور میری عمر کے بچوں کو کیا حکم دیں گے کہ ہم اپنے پیارے وطن پاکستان کے لیے کچھ کریں۔

محمد علی جناح: کام' کام اور کام..... میری نوجوانوں سے بس یہی استدعا ہے۔

اسلم: ہم سب آپ کو سلام کرتے ہیں۔ قائداعظم زندہ باد..... پاکستان پائندہ باد (اسلم نے پیشانی پر انگلیاں رکھ کر سیلیوٹ کے سے انداز میں سلام کیا)

"اٹھو اسلم' اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے۔" امی جان اسلم کو جگا رہی تھیں اور وہ مسلسل کہے جا رہا تھا۔

"قائداعظم زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!

"خدا کے لیے بھیا اب تو اٹھ جاؤ! بہنا نے آکر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ نیند میں وہ پلنگ کے برابر کھڑا ہو گیا مگر اس کا دایاں ہاتھ ماتھے پر سیلیوٹ کے انداز میں رکھا ہوا تھا۔ امی جان مسکرانے لگیں۔ "رات یہی باتیں کرتے کرتے وہ سو گیا تھا اور اب یہی خواب دیکھ رہا تھا کہ صبح ہو گئی"۔

کارتوس

حامد مشہود

کمرے میں بے ہنگم موسیقی کا شور مچا ہوا تھا اور کارتوس فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنی گن میں کارتوس بھر رہا تھا۔ کارتوس ایک بڑا مجرم تھا۔ اس نے اپنی گن پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ اس کے پاس پڑا ٹیلی فون اچانک چہک اٹھا۔ کارتوس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور بولا "ہیلو"۔

"ہیلو کارتوس! کیسے ہو؟" دوسری طرف سے ایک اور مجرم "ٹی ٹی" نے کہا۔

"ٹھیک ہوں" کارتوس نے اپنی گود میں پڑے کارتوس سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"تیز موسیقی سن رہے ہو بھئی" ٹی ٹی بولا

"کام کی بات کرو" کارتوس غرایا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر سی ڈی پلیئر بند کر دیا۔

"ایک مشین کو بٹن لگانا ہے" ٹی ٹی نے خفیہ الفاظ میں کسی کو اغوا کرنے کی بات کی۔

"لگ جائے گا" کارتوس نے جواب دیا۔

"مگر مشین ذرا بھاری ہے" ٹی ٹی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، تم سودا طے کرو" کارتوس بولا۔

"تو کہاں ملو گے تم؟"

"جہاں اس رات ملے تھے" کارتوس نے کہا "میں چالیس منٹ میں اس ہوٹل کے باہر پہنچ جاؤں گا"۔

کارتوس تیس منٹ میں سنگم ہوٹل کے سامنے پہنچ گیا۔ سنگم ہوٹل شہر کے باہر بہنے والے دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ لوگ رات گئے تک وہاں سے اشیائے خورونوش خریدتے تھے۔ کارتوس ہوٹل کے سامنے ریتلی زمین پر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اردگرد کچھ لوگ کھا پی رہے تھے مگر وہ گہری نظروں سے ہر طرف، غیر محسوس انداز میں دیکھ رہا تھا۔

ٹی ٹی نے اسے انتظار کی زحمت نہ دی۔ وہ اپنی مہنگی گاڑی میں وہاں جلد ہی پہنچ گیا۔ انہوں نے تلی ہوئی مچھلی خریدی اور گاڑی میں ہوٹل سے دور چلے گئے۔ گاڑی میں سردی کا احساس کم تھا، رات بہت کالی تھی اور دو مجرم ایک کالا کام کرنے کا منصوبہ طے کر رہے تھے۔

سودا طے ہو گیا اور کارتوس نے ٹی ٹی سے پیشگی رقم بھی وصول کر کے اپنے کوٹ کی جیب میں اڑس لی۔

سورج نے کئی روز بعد اپنا جلوہ دکھایا تھا اس لیے دسمبر میں بھی نرم گرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جماعت کے لڑکے سرسبز گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے اور مس شگفتہ طلبہ کو اردو پڑھا رہی تھیں۔ اس روز کا کام جلد ہی ختم ہو گیا۔ مس شگفتہ نے اپنے کلائی پر بندھی ہوئی ننھی گھڑی دیکھی، چھٹی ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔

اچانک قمر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، اس نے پوچھا "مس! کارتوس کسے کہتے ہیں؟"

مس شگفتہ مسکرا کر بولیں "کارتوس کو ہی کارتوس کہتے ہیں"۔

سب لڑکے ہنس دیئے تو مس نے پھر پوچھا "کیا آج شکار پر جانے کا ارادہ ہے؟"

قمر نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا "نہیں مس! ویسے پوچھ رہا ہوں"

مس شگفتہ اپنی ذات میں خود ایک اسکول تھیں۔ انہوں نے بتایا: "کارتوس اردو زبان میں انگریزی لفظ کارٹریج سے بنایا گیا ہے۔ کارتوس ایک بڑی گولی ہوتی ہے۔ کھلونوں میں استعمال

ہونے والے بیٹری سیل کے مشابہ۔ کارتوس میں بہت سے چھرے ہوتے ہیں یعنی چھوٹے چھوٹے نوکیلے جستی ٹکڑے جو کہ بارود کے زور پر چلتے ہیں۔ کارتوس کا خول پلاسٹک سے بنا ہوتا ہے اور اس کی پشت تانبے کی ہوتی ہے۔ کارتوس کو جب بندوق میں ڈال کر استعمال کیا جاتا ہے تو خالی خول بندوق کی نال میں رہ جاتا ہے اور چھرے بارود کے زور پر باہر نکل جاتے ہیں"۔

قمر نے اپنا سر پھر کھجاتے ہوئے پوچھا "مس! کارتوس میں کتنے چھرے ہوتے ہیں؟"

مس شگفتہ نے بتایا "جو کارتوس بڑے درندوں کو مارنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان میں بڑے چھرے ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد کم ہوتی ہے اور جو کارتوس پرندوں یا چھوٹے جانوروں کا شکار کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان میں چھوٹے چھوٹے چھرے بہت زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں اور یہ چھرے بہت سی جگہ کو گھیر لیتے ہیں۔ پہلے پہل کارتوسوں کے خول گتے سے بنتے تھے۔ ایسے کارتوس پانی لگنے سے ضائع ہو جاتے تھے۔ اب پلاسٹک کے خول والے کارتوس پانی سے ضائع نہیں ہوتے اور قمر خان بارش میں بھی گیدڑ کا شکار کر سکتا ہے"۔

اس معلومات افزا بیان کا اختتام شگفتگی پر ہوا تو پھر سب کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مس شگفتہ کی یہ خاص خوبی تھی کہ وہ علم کو دل چسپ بنا دیتی تھیں۔ گھنٹی بجنے میں سات منٹ باقی تھے کہ اچانک ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر کہا "مس! میرا بستہ اندر کمرے میں پڑا ہے اگر آپ....."

"بھئی اپنے اپنے بستے کمرے سے اٹھا لاؤ' چھٹی ہونے والی ہے" مس نے کتاب پر سے اپنی نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

چند لڑکے 'جو اپنے بستے کمرے میں ہی چھوڑ آئے تھے' لینے چلے گئے۔ اچانک پاکستان اسکول کا بڑا پھاٹک کھلا اور ایک تیز رفتار جیپ اس باغیچے تک آن پہنچی جہاں جماعت ہشتم ڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ جیپ میں سے دو غنڈے اچھل کر باہر نکلے اور باڑ پھلانگ کر مس شگفتہ کے سرہانے آ کھڑے ہوئے۔ مس شگفتہ ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک غنڈے نے ان کے سر پر پستول کی نال سے ٹھوکا دیا اور دوسرے نے اسلحہ لڑکوں پر تان کر انہیں خاموش اور بے حس و حرکت رہنے کا حکم دیا۔

پستول کا ٹھوکا لگتے ہی مس اپنی کرسی پر گر گئیں۔ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

"قمر خان کون ہے؟" ایک غنڈا غرایا۔

دوسرے غنڈے نے سب لڑکوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ مجبور لڑکے کھڑے ہو گئے۔ غنڈے نے لڑکوں کے سینوں پر آویزاں اسکول کارڈ دیکھے اور چند لمحوں بعد اس نے قمر خان کو پکڑ لیا۔

"یہ کلاس ایٹ ڈی ہے ناں؟" غنڈے نے مس کے سر پر پھر اسلحہ تان کر پوچھا۔ مس نے ہاں میں بمشکل ہی سر ہلایا۔

غنڈوں نے قمر خان کا اسکول

کارڈ غور سے دیکھا۔ اس کارڈ پر لکھا تھا "قمر خاں' ہشتم ڈی' پاکستان اسکول"

غنڈے قمر خان کو جیپ میں ڈال کر لے گئے۔ اسکول کا چوکی دار اور ایک ملازم' دونوں افراد بے ہوش پڑے تھے۔ چوکی دار کو پھاٹک کھولنے کے لیے بے ہوش کیا گیا تھا اور ملازم کو ہشتم ڈی کا پتا معلوم کرنے کے بعد۔

اسکول کی پرنسپل میڈم نصرت نے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی لیکن اسکول کا فون مردہ پڑا تھا' باہر سے تار کاٹ دیا گیا تھا۔

انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت میں اس روز ایک اہم فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ اس لیے عدالت کا ہال نمبر 4 بھرا پڑا تھا اور کرسیوں پر اخباری نمائندگان بھی براجمان تھے۔ ملزموں کے دوست اور پولیس والے بھی موجود تھے۔ دو ملزم کٹہرے میں کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر بے خوفی تھی حال آں کہ ان پر قتل و غارت کا الزام تھا۔

مشہور منصف' شیر خان وقار کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بہت سخت گیر ہیں۔ جائز کو جائز اور ناجائز کو ناجائز ہی قرار دیتے ہیں۔ بے گناہ کو بری کرتے اور گناہ گار کو سزا دیتے ہیں۔ ان کا بے داغ ماضی گواہ تھا کہ وہ نہ جھکتے تھے اور نہ بکتے تھے..... شیر خان کی آمد پر حاضرین بھی ان کے احترام میں کھڑے ہوئے۔ شیر خان نے حاضرین کو سلام کہا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہمیشہ اسی انداز میں آتے تھے۔

شیر خان اس کرسی پر بیٹھے جس کی پشت غیر معمولی طور پر بلند تھی۔ عدالت کے اہل کاروں نے ان کے آگے کاغذات رکھے۔ عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا مگر دونوں ملزم مسکرا رہے تھے۔ اچانک شیر خان کی شیروانی کی جیب میں موجود موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے فون نکال کر کسی سے گفت گو کی۔ حاضرین میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئی تھیں کہ دولت یا سفارش ابھی فیصلہ بدل ڈالے گی۔

شیر خان نے فون پر ہونے والی گفت گو سن کر حاضرین کو گہری نظروں سے دیکھا اور کہا "ان ملزمان' عدنان عرف عیدی اور تنویر عرف تنو کی پر دہشت گردی کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔ اب یہ دونوں ملزم نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ مجھ پر کئی روز سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ میں ان دہشت گردوں کو بری کر دوں یا کم از کم نرم سزا دے دوں..... واضح رہے کہ انہوں نے غیر ملکی اشارے پر بازار میں اندھا دھند گولیاں برسا کر ان چھ بے گناہ لڑکے لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا جو اپنے کالج سے باہر نکل رہے تھے۔ آپ لوگ نہیں جانتے کہ میرا ایک پوتا ہے' قمر خان' قمر خان میرے بیٹے کا بیٹا ہے اور میرا بیٹا اپنی بیوی سمیت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بیرون ملک تین سال کے لیے گیا ہوا ہے..... اور آج میرے پوتے کو اغوا کر لیا گیا ہے تاکہ میں اپنا فیصلہ بدل کر درندوں کو کھلا چھوڑ دوں اور وہ بے جان سکوں کی خاطر جان دار انسانوں کے خون کی ندیاں بہاتے رہیں۔ میں اپنے پوتے کو خود سے دور رکھتا تھا کہ دشمن اسے میری مجبوری بنا کر مجھے مجبور نہ کر سکے۔ وہ بالکل خفیہ انداز میں اپنے نانا نانی کے ساتھ شہر کے ایک کونے میں رہتا تھا۔ چند افراد کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ قمر میرا پوتا ہے۔ مگر آج کوئی چالاک مجرم اس تک پہنچ گیا ہے تاکہ مجھے مجبور کیا جا سکے کہ میں اپنے لاڈلے پوتے کی جان کے عوض اپنا فیصلہ بدل دوں"۔

شیر خان نے پھر ذرا رک کر سب کو دیکھا اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"جب چھٹی کے وقت' بڑے اسکول کا پھاٹک کھلتا ہے تو ایک سی وردی میں بچوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ذہین مجرم نے میرا پوتا اس وقت اسکول میں سے ہی اٹھا لیا جب چھٹی میں ابھی کچھ وقت باقی تھا تاکہ وہ چھٹی کے بعد بھیڑ میں گم نہ ہو جائے۔ میں مجرم کی ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں مگر افسوس کہ مجرم نے ذہانت برے کام میں صرف کی ہے۔ میری بیوی کو دو افراد نے فون کیے ہیں۔ پہلے اسکول کی میڈم نے' کیوں کہ وہ مجھے جانتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قمر خاں میرا پوتا ہے۔ پھر مجرم نے فون پر میری بیوی کو فون کیا کہ میں اپنا فیصلہ بدل کر خود میں لچک پیدا کر کے اپنا پوتا حاصل کر سکتا ہوں..... میری بیوی نے مجھے یہ دونوں پیغام بتائے ہیں۔

دوستو! جو کام دولت اور سفارش سے نہ ہوا وہ اب

رشتوں کی کشش سے کروانے کی کوشش کی گئی۔

ابھی تو صرف میرا پوتا اغوا ہوا ہے میں امن کے دشمنوں پر واضح کرتا چلوں کہ آپ لوگ میرا سارا خاندان اغوا کر لیں یا مار ڈالیں' میں نہ جھکوں گا نہ بکوں گا۔ اگر آج میں نے امن کے دشمنوں کو چھوڑ دیا تو ہو سکتا ہے کہ کل آزاد قمر خاں ہی کسی دہشت گرد کا شکار ہو جائے"۔

شیر خاں نے شیر کی طرح گرج کر مجرموں کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ مجرموں کے چہرے اچانک لٹک گئے اور لوگ اش اش کر اٹھے۔

قمر خاں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ اس کے سامنے پلنگ پر ایک غنڈا پستول سے کھیل رہا تھا۔ چانک پلنگ پر پڑے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ غنڈے نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو ہیلو"۔

شاید ریسیور خراب تھا۔ غنڈے نے فون کا لاؤڈر آن کر دیا اور بولا "ہیلو"

"ہیلو..... جانو! کیا حال ہے؟" لاؤڈر آن ہونے سے فون کرنے والے کی آواز کمرے میں پھیل گئی۔

"ٹھیک ہوں جناب!" جانو نے بستر پر نیم دراز ہو کر کہا۔

"حالات؟"

"اے وان جی" جانو نے کہا۔

"لڑکا کیا کر رہا ہے؟"

"وہ بار بار اپنا سر کھجا رہا ہے" جانو بولا

"سر کھجا رہا ہے؟"

"آہو جی"

ہوا یوں کہ عیدی اور تنوکی' دونوں ٹی ٹی کے خاص دہشت گرد تھے اور ٹی ٹی پاکستان میں غیر ملکی ایجنٹ تھا۔ جب شیر خان دولت اور دھونس سے مرعوب نہ ہوا تو اس نے کارتوس سے رابطہ کیا۔ کیوں کہ ٹی ٹی کے پاس ان دنوں بندے نہ تھے۔ کارتوس نے بڑی رقم لے کر شیر خان کی دکھتی رگ کو جا پکڑا یعنی قمر خان کو اغوا کرنے کے لیے اپنے غنڈے بھیجے۔ اتفاق کی بات کہ ہشتم ڈی کا طالب علم قمر خان جو شیر خان کا پوتا تھا' اس وقت اپنا بستہ لینے کمرے میں گیا ہوا تھا اور غنڈے غلطی سے دوسرے قمر خان کو لے گئے جو کارتوس کا بیٹا تھا۔

پھر قمر خان نے ٹیلی فون سیٹ کے لاؤڈر پر اپنے باپ کی آواز پہچان لی۔ جب کہ کارتوس بھی چونک اٹھا تھا کہ لڑکا بار بار اپنا سر کھجا رہا ہے۔ اسے شک گزرا کہ یہ عادت تو اس کے اپنے بیٹے کی ہے اور وہ بھی تو پاکستان اسکول کا ہی طالب علم ہے۔ مگر کارتوس کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا بھی ہشتم ڈی ہی کا طالب علم ہے۔ معاملہ بالکل الٹ ہو گیا۔ مجرموں کی سازش بری طرح ناکام ہو چکی تھی اور ایمان دار منصف شیر خاں اس امتحان میں سرخرو ہو گئے تھے بلکہ ان کا پوتا بھی بالکل محفوظ تھا۔ قمر خان کو چھوڑ دیا گیا۔ مگر قمر خان نے یہاں سے رہا ہونے کے بعد سب سے پہلے کام یہ کیا کہ پولیس کو اپنے مجرم باپ کے ٹھکانے کا پتا بتا کر گرفتار کرا دیا۔

قمر خان نے اپنے باپ کے منہ سے ایک دو بار لفظ "کارتوس" سنا تھا لیے وہ مس شگفتہ سے کارتوس کے متعلق معلومات حاصل کر رہا تھا۔

پھر ایک دن قمر خان کئی ماہ بعد اپنی والدہ کے ساتھ اپنے والد کو ملنے جیل گیا تو کارتوس نے جیل کی سلاخوں میں سے اپنا ہاتھ باہر نکال کر قمر کے سر پر شفقت سے پھیرا اور کہا۔

"بیٹا! میں تیرا احسان مند ہوں کہ تو نے مجھے صحیح راستہ دکھایا۔ اب کارتوس چل گیا ہے صرف کریم خان زندہ ہے۔ میں جیل میں سے باہر آؤں گا تو اچھا ذہن لے کر آؤں گا۔ تو بھی اس وقت تک پولیس میں بھرتی ہو جانا"۔

"بیٹا! میں نے سب لوگ پکڑوا دیئے ہیں' سارا کچھ پولیس اور فوج کو بتا دیا ہے مگر یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ میں نے اپنی قیمتی ریپیٹر گن اور بڑھیا کارتوسوں کا ذخیرہ ایک خفیہ مقام پر چھپا رکھا ہے۔ میں وہ اسلحہ اور کارتوس اپنے پاس رکھوں گا تاکہ میرے مرتے دم تک پھر کوئی اس حسین دنیا کا حسن برباد کرنے کی کوشش نہ کرے"۔

قمر خان نے مسکرا کر اس روز کئی ماہ بعد اپنا سر پھر زور سے کھجایا۔

وہ ایک سفر

6 ستمبر 1965 کا آنکھوں دیکھا حال۔ لمحہ بہ لمحہ رُوداد

نیاز علی بھٹی

اس سفر کا آغاز میرے گاؤں سے ہوتا ہے۔ آیئے پہلے میں آپ کو اپنے گاؤں لے چلوں۔ یہ ہے میرا گاؤں دھیر کے۔ یہاں سے بھارت کتنی دور ہے؟ آپ اس کا اندازہ بھارت کے اس گاؤں کو جس کا نام داؤ کے ہے' دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ ان دونوں گاؤں کے درمیان کھیت ہیں یا سرحد کی برجیاں۔

میں 6 ستمبر 1965ء کو اسی گاؤں میں تھا اور بھارتی توپوں کی گھن گرج سن رہا تھا۔ یوں تو بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور توپ کی گھن گرج سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے کیوں کہ یہ آوازیں تو ان کی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن 6 ستمبر 1965ء کے دن یہ گھن گرج کسی اور انداز میں آئی۔

مجھے یاد ہے' اس دن مجھے لاہور جانا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پنجاب یونی ورسٹی میں داخلہ لوں۔ 6 ستمبر 1965ء شاید داخلے کا آخری دن تھا لہٰذا میں نے صبح سویرے ہی اپنے گاؤں کو چھوڑا۔ پنجاب یونی ورسٹی میرے گاؤں سے اندازاً پندرہ میل کے قریب ہے جس کے لیے مجھے برکی لاڈہ سے جو میرے گاؤں سے قریباً تین میل دور ہے بس پکڑنی تھی۔

میں اپنے گاؤں سے دو میل ہی دور گیا ہوں گا کہ میرے سر کے اوپر سے چند جہاز چیختے چنگھاڑتے گزرے۔ اس اچانک شور کے لیے میں بالکل تیار نہ تھا۔ میں فوراً زمین پر لیٹ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان مجھ پر گر پڑا ہے۔ جہاز کی آواز اس قدر نزدیک اور زور دار تھی کہ زمین دہل گئی۔ اس غیر متوقع واقعہ نے مجھے ششدر کر دیا اور میں اس شش و پنج میں تھا کہ کیا کروں' آیا لاہور جاؤں یا واپس اپنے گاؤں۔ میں دم سادھے زمین پر پڑا تھا کہ محسوس ہوا کہ آواز کم ہو گئی ہے۔ جان میں جان آئی۔ اٹھا' کپڑے جھاڑے اور لگا جہازوں کو گننے' جو بہت مشکل تھا۔ جہاز میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھے مگر صبح سویرے حد بندی لائن پر جہازوں کا پرواز کرنا اچنبھے والی بات ضرور تھی۔ خیال آیا کہ شاید مشق کر رہے ہوں۔ اور پھر میں اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ کھیت میں چھپا ہوا ایک زمین دار بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور ہانپتا کانپتا پوچھنے لگا۔

"کی کوئی جاز ڈگ پیالے" (کیا کوئی جہاز گرا ہے)

"نہیں فکر نہ کرو' جہاز مشق کر رہے ہیں"۔ میں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ میرے جواب سے مطمئن نظر نہ آتا تھا۔

میں اس واقعے کو بھلا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ راستے میں ایک گاؤں پڑتا ہے جس کا نام ہے۔ برکا' وہاں پہنچا۔ زندگی اپنے معمول پر تھی۔ وہی دیہاتی لوگ تھے اور وہی ان کے معمولات۔ کوئی مسواک کر رہا تھا' کوئی سر پر چارہ اٹھائے آ رہا تھا۔ کچھ لوگ کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ گاؤں کے کنوئیں پر ماشکی پانی بھر رہا تھا۔ مجھے وہاں کسی قسم کی تبدیلی نظر نہ آئی مگر ایک چیز ضرور میں

نے دیکھی کہ کبھی کبھی لوگ آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھتے تھے اور پھر کوئی چیز نہ پا کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہاں سے میں ب۔ کی گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ سورج مشرق سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رستے میں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج لوگ سورج کی کرنوں سے بے پروا ہیں۔ کیوں کہ پہلے کی نسبت برکی کو جانے والے راستے پر کم چہل پہل تھی۔ ورنہ یہ راستہ تو گوالوں سے بھرا ہوتا تھا۔ میں برکی کی طرف تیز رفتاری سے چلنے لگا کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پہلی بس چھوٹ نہ جائے۔

برکی پہنچا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آج اس گاؤں میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ میں نے دیکھا کہ آج گاؤں میں کچھ بے اطمینانی سی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ لوگ اپنے معمولات بھول جائیں۔ جامع مسجد میں نہانے والوں کا، جو عموماً نمازیوں سے زیادہ ہوتے ہیں، وہی جمگھٹا تھا اور حلوائی کی دکان پر دہی کی لسی کے دو دو منزلہ گلاس چل رہے تھے۔

میں گاؤں میں سے گزر کر بس کے اڈے کی طرف گیا۔ یہ گاؤں سے باہر "لاہور ہر یکے روڈ" (موجودہ غازی روڈ) پر برکی تھانے کے پاس ہے۔ لیکن افسوس! پہلی بس نکل گئی۔ وہ مجھ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے بہت شور مچایا اور ہاتھ ہلائے مگر ڈرائیور میرے باپ کا نوکر تو تھا نہیں کہ بس روکتا۔ حکومت کا کھاتا پیتا کارندہ تھا اور پھر اس وقت بس کا مالک بھی، سو وہ نکل گیا۔

اب اڈے پر میں اکیلا مسافر تھا۔ آج یہاں کچھ رونق بھی نہ تھی۔ حال آں کہ یہ اڈا گوالوں کی آرام گاہ کہلاتا ہے۔ سارا دن اور رات لاہور آنے جانے والے گوالے یہاں موجود ہوتے تھے اور لین دین کرتے تھے۔ مگر آج یہاں سوائے میرے اور دو ایک دکان داروں کے کوئی موجود نہ تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید جلدی آ گیا ہوں۔ مگر اب تو سورج بھی نکل آیا تھا۔ دل و دماغ نے گواہی دی کہ آج دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ایک دکان دار سے دوسری بس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا "جب خدا کو منظور"

اس سے گپ لگانے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ آج وہ گپ شپ کے موڈ میں نہ تھا۔

اتنے میں ایک فوجی جیپ آئی اور میرے سامنے آ کر رکی۔ ایک فوجی افسر اترا اور کہنے لگا کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور سڑک بالکل صاف کر دیں۔ میں نے سوچا کہ شاید آج یہاں ہمارے فوجی کسی مشق پر آ رہے ہیں اور یقیناً پیچھے کوئی کانوائے آ رہا ہے۔ اتنی دیر میں تھانے سے ایک سپاہی آیا اور مجھے بھی گھر

جانے کے لیے کہا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ آج کیا ہو رہا ہے تو اس نے کہا کہ پتا نہیں ہڈیارہ پل کے پرے سے کوئی جواب یا آدمی نہیں آرہا۔

میں نے صبح سے اب تک کے حالات کا جائزہ لیا لہٰذا فوراً برکی گاؤں کو پلٹ آیا مگر میں نے دیکھا کہ چند منٹ پہلے کے برکی اور اب میں بہت فرق تھا۔ چند ایک واقف کاروں سے وجہ پوچھی تو انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو نیلے آسمان کے بجائے سفید دھواں نظر آیا۔ یہ گولوں کا دھواں تھا۔ دوسرے ہی لمحے یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ گولے کہاں سے آرہے ہیں اور کیوں آرہے ہیں۔ توپ چلنے کی آواز صاف آرہی تھی۔

برکی گاؤں میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہڈیارہ پر بھارتی فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ "نہیں یہ کیسے ممکن ہے' یقیناً کسی دشمن نے افواہ اڑائی ہے" میں نے سوچا مگر دل نے کہا کہ دشمن سے کچھ بھی بعید نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ اگر بھارت کے حملے والی بات درست ہے تو اب تک بھارتی فوج میرے گاؤں پر بھی قبضہ کر چکی ہو گی کیوں کہ جس رفتار سے گولوں کی آواز بڑھ رہی تھی یہ بعید نہ تھا۔ پھر جب یہ خیال گزرا کہ میرے بوڑھے والدین بیوی بچے اور بہن بھائی بھارت کی قید میں ہوں گے' بھارتی درندے ان پر ظلم کر رہے ہوں گے' تو دل نے کہا "اب عمل کا وقت آن پہنچا ہے" مگر حالات کے ہاتھوں میں اتنا مجبور تھا کہ کوئی راہ نہ سوجھی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ گاؤں واپس نہ جانا' باقی گھر والے تو بھارت کے ہاتھوں میں گئے تم کیوں جان گنواتے ہو؟ یہیں آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ دل نے کہا' یہ ضروری نہیں' ہو سکتا ہے کہ ابھی تک والدین بچے اور بہن بھائی تمہارے انتظار میں صحیح سلامت ہوں۔ ماں باپ نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ کیا اس لیے کہ آج مصیبت کے وقت تم ان کو بھارتیوں کے ظلم تلے پسنے دو اور خود اپنی جان بچاتے پھرو۔ ہمت نہ ہارو' اللہ کا نام لے کر چل پڑو' تمہاری ایک جان ان کی عزت اور جان کے مقابلے میں خاک بھی نہیں۔

بس دوسرے ہی لمحے میں اسی پگڈنڈی پر جس سے ابھی کچھ منٹ پہلے گزرا تھا واپس گاؤں کی طرف سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ دوڑتا بھاگتا جب میں برکا گاؤں پہنچا تو گاؤں سے باہر مجاہد فورس کے چند جوان ملے۔ ان کی وردیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ بندوقوں پر گیلی مٹی جمی ہوئی تھی' جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ جوان ہڈیارہ نالہ عبور کر کے آرہے ہیں۔ ان کے چہروں سے' معلوم ہو رہا تھا کہ خدا جانے ان بے چاروں پر رات کے اندھیرے میں کیا گزری۔ ان کو دیکھ کر میں ذرا رکا اور ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ ایک کو میں نے پکڑ کر بٹھایا تو وہ ہکلاتے ہوئے' صرف یہ کہہ سکا "بھارتی..... فوج..... ہڈیارہ..... قبضہ" اس کے لیے یہ چار الفاظ میرے لیے کافی تھے اور میں ڈبل رفتار سے دوڑ پڑا۔ برکا گاؤں پہنچا تو وہاں کے حالات بھی تبدیل شدہ پائے۔ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں میں باہر مجھے کوئی شخص نہ ملا بلکہ مجھے بھاگتا ہوا دیکھ کر لوگ اور بھی متفکر ہوئے۔ ایک بزرگ نے جو کہ شاید مجھے جانتے تھے' چھت ہی سے تسلی دی "بیٹا فکر نہ کرو۔ ہمت سے کام لو"۔ ان حالات میں بزرگ کے یہ الفاظ میرے لیے بڑے حوصلہ افزا تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر جواب دیا' کیوں کہ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔

برکا گاؤں سے اب میں اپنے گاؤں والے راستے پر دوڑ رہا تھا۔ راستے میں میں نے جو ذرا ہڈیارہ کی طرف نظر اٹھائی تو میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی کیوں کہ دور سے انسانی سر نظر آرہے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں یہ سمجھا کہ بھارتی فوج ہڈیارہ نالہ عبور کر کے برکی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے سوچا' خدانخواستہ اگر یہ بھارتی برکی پہنچ گئے اور بی آر بی نہر پر قبضہ کر لیا تو پھر یہ لاہور کی طرف پیش قدمی کریں گے اور اگر یہ بدقسمتی ہوئی تو ہم یہاں مارے جائیں گے اور خدا جانے لاہور پر کیا آفت آئے۔ مگر ان خدشات کے باوجود دل کو یقین تھا کہ لاہور زندہ رہے گا۔ میں نے پھر ہمت کی اور پوری قوت سے بھاگنا شروع کیا مگر قدم آگے رکھتا تھا اور پڑتا پیچھے کی طرف تھا۔ بھارتی فوج اب سایوں میں بدل چکی تھی اور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان سایوں نے ایک قافلہ کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ایسا قافلہ تھا جو رات کے اندھیرے میں راہزن کے ہاتھوں لٹ گیا تھا۔ یہ مرد و زن کا بھاگتا ہوا ایک ریلا تھا۔ لٹے پٹے پاکستانیوں کا قافلہ تھا۔

قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ہڈیارہ کے رہنے والے لوگ تھے جو بھارتی فوج کے ہاتھوں اپنی عزت و جان بچا کر وہاں سے نکلے تھے۔ راستے کے سفر نے ان لوگوں کی حالت خستہ کر دی تھی۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بچے خوف سے رو رہے تھے۔ عجیب بات تھی کہ آج وہ پاکستان میں ہوتے ہوئے بھی دوبارہ مہاجر بن گئے تھے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ان کے چہروں سے یہ عزم عیاں تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ بھارت کے دوبارہ غلام نہیں بنیں گے اور یہی ایک جذبہ تھا جو انہیں ہڈیارہ سے نکال لایا تھا۔

میں ان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنے گاؤں کی طرف بھاگ اٹھا۔ اپنے گاؤں پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ وہاں کے لوگ ابھی تک اپنے اردگرد کے حالات سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ بلکہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ پہلے تو لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا اور میں وہ سب کچھ بھول گیا جو راستے میں میں نے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کتنے بلند حوصلہ ہیں یہ لوگ! اس سکون کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرا گاؤں گو سرحد سے بالکل نزدیک ہے مگر سڑک سے ہٹ کر ہے۔ بھارتی فوج نے سب سے پہلے سڑک پر قبضہ کیا۔ چناں چہ سڑک سے دور کے دیہات ان کی زد سے دن چڑھنے تک بچے رہے۔ اگر بھارت اپنی پیدل فوج کو داؤ کے گاؤں کی طرف سے ہمارے گاؤں کی طرف روانہ کرتا تو ہم بھی کبھی کے ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بن چکے ہوتے۔

گھر پہنچا' والدین نے دعائیں دیں اور ہماری اللہ رکھی کی آنکھوں سے بھی دو بڑے بڑے آنسو بہ نکلے۔ وہ دو دنوں سے بیمار تھی اور چارپائی سے نیچے اترنا اس کے لیے محال تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور والد صاحب کو جو کچھ میں نے دیکھا تھا بتا دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ جلدی سے گاؤں چھوڑ دیں یا وقت کا انتظار کریں۔ میں تو انتظار نہ کرنا چاہتا تھا مگر والد صاحب نے یہ کہہ کر کہ وہ نہیں جائیں گے میری کمر توڑ دی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ہڈیارہ میں جو کچھ ہوا ہے وہی کچھ ہمارے گاؤں میں بھی ہو سکتا ہے مگر وہ نہ مانے' کہنے لگے "سارا گاؤں ہمارے گھر پر نظر لگائے بیٹھا ہے کہ ہم بسم اللہ کریں اور وہ لبیک کہیں" یہ اس لیے تھا کہ ہمارا گھر فوجی روایات کے لیے مشہور تھا۔ ابا جی اپنی جنگی اور فوجی زندگی کی بنا پر کہہ رہے تھے کہ بھارت بغیر اعلان جنگ کے ہم پر حملہ نہیں کر سکتا مگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا' اس فلسفے پر یقین کیسے کرتا' مجبوراً چھت پر گیا کہ دیکھوں گاؤں کے اردگرد کیا حالت ہے۔ دور دور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک ہمارا گاؤں ظالموں سے محفوظ ہے مگر توپ کی آواز برابر آ رہی تھی اور کسی وقت بھی دشمن اس کے دہانے کا رخ ہمارے گاؤں کی طرف کر سکتا تھا۔

میں گھر سے باہر نکلا کہ دیکھوں گاؤں کے لوگوں کا کیا حال ہے۔ چاروں طرف سے سوالیہ نگاہوں نے مجھے دیکھ کر کچھ بزرگوں نے پوچھا بھی کہ اب کیا کریں؟ میں نے کہا "ہم مریں گے بھی اکٹھے اور جئیں گے بھی اکٹھے۔ کوئی فکر کی بات نہیں" مگر گاؤں کے لوگوں کی سوالیہ آنکھوں کو دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ہماری آزادی چند ہی لمحوں کی ہے۔ بھارتی فوج اب آئی کہ آئی۔ اور ہم سب کو دھکیل کر بھارت لے جائے گی۔ مگر میں یہ بات گاؤں کے لوگوں سے کہ نہیں سکتا تھا۔ گھر آیا' دوبارہ چھت پر چڑھ گیا۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی چھتوں پر کھڑے تھے۔ اچانک ہڈیارہ کی طرف سے شور سنائی دیا۔ غور سے سنا اور دیکھا تو تین اطراف سے دوسرے دیہات کے لوگ ہماری طرف آ رہے تھے اور اب گولے بھی کھلے میدان میں آ کر گرنے لگے تھے۔ تاہم ہمارا گاؤں بچا ہوا تھا۔ میں بھاگم بھاگ والد صاحب کے پاس آیا جو بڑے اطمینان سے بڑ کے درخت تلے حقہ پی رہے تھے اور والدہ صاحبہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔ والدین واقعات سن کر حیران ہوئے مگر ابھی تک بضد تھے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ بین الاقوامی اصولوں کے تحت بھارت بغیر اعلان جنگ کے ہمارے علاقے پر حملہ نہیں کر سکتا۔ میں نے کافی سمجھایا کہ بھارت ایسے دشمن سے اصولوں کی توقع بے کار ہے۔ سوچ رہا تھا کروں تو کیا کروں' بار بار ابا جی اور اماں جی سے درخواست کر رہا تھا کہ خدا کے واسطے عزت و جان کی خاطر اب گاؤں سے چلیں مگر وہ راضی کہاں ہوتے تھے۔ ابا جی نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ مجھے بھارتی فوج کی یلغار تک بھول گئی۔ ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ اچانک ایک گولا ہمارے گاؤں کی مسجد میں جو کہ میرے گھر کے دروازے سے

بمشکل 25 گز کے فاصلے پر ہو گی' آ کر پھٹا۔ ہم سب کے رنگ اڑ گئے ہمارے گاؤں کی طرف دشمن کی فوج کی پیش قدمی ظاہر ہو گئی تھی جو یقیناً گولوں کی آڑ میں بڑھ رہی ہو گی۔ اب والدین نے بھی محسوس کیا کہ میں اب تک جو انہیں بتا رہا تھا وہ بالکل سچ تھا اور انہوں نے خود ہی کہا کہ اب چلنا چاہیے۔ خدا کا شکر کیا کہ یہ بزرگ راضی ہوئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا اٹھایا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔ چھوٹی بہن نے جس کی شادی عنقریب ہونے والی تھی' اپنے جہیز کی چند خاص خاص چیزیں صندوق میں رکھ لیں کہ یہ اٹھا کر لے چلیں گے مگر حالات نے یک لخت ایسا پلٹا کھایا کہ کسی چیز کا اٹھانا تو دور کی بات گھر کے تالے بھی نہ لگا سکے اور 1947ء سے اب تک کی کمائی وہیں چھوڑ کر خالی ہاتھ جن کپڑوں میں تھے جان و عزت کی خاطر چل دیئے۔ ہمارا گاؤں سے نکلنا تھا کہ گاؤں کے سارے لوگ قافلے کی صورت میں بی آر بی کی طرف چل پڑے۔

آج میری زندگی میں قافلے کے ساتھ چلنے کا دوسرا موقع تھا۔ ایک تو وہ جب میں ابھی بچہ تھا اور 1947ء میں ہندوستان سے پاکستان آیا تھا' آج بھی ان مشکلات کو یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا وقت تھا لوگوں کو خون آلود پانی تک پینے کو میسر نہ تھا۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ دوسرا آج کا موقع تھا کہ ہم مکار دشمن کے ہاتھوں اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو گئے تھے۔ 1947ء میں تو ہم نے بھارت اس امید پر چھوڑا تھا کہ پاکستان میں اپنی حکومت ہو گی۔ ہم کسی کے غلام نہ ہوں گے' اپنی روایات ہوں گی اور اپنا معاشرہ ہو گا مگر آج یہ فکر تھی کہ اب پاکستان سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت میں بچہ تھا اور دوسروں کے کاندھے کا بوجھ مگر آج دوسروں کے بوجھ سے کمر ٹوٹے جا رہی تھی' خیر اب ان یادوں کا وقت نہ تھا۔

گاؤں سے نکلے تو مرد و زن بوڑھے بچے عزیز و اقارب گولوں کے سائے میں لاہور کی طرف رخ کیے چل رہے تھے یا بھاگ رہے تھے۔ اس بھگدڑ کی وجہ یہ تھی کہ جتنی رفتار سے ہم بھاگ رہے تھے اتنی ہی رفتار سے گولے ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔

ہر طرف شور اور افراتفری تھی۔ چاروں طرف دھان کی فصل تھی اور کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ بس کچھ نہ پوچھیے کیا حالت تھی۔ فصلوں میں گرتے پڑتے انسانوں کا ایک ریلا تھا اور سب کا رخ ایک ہی طرف تھا' منزل ایک تھی اور وہ تھی بی آر بی نہر۔ جذبہ بھی ایک تھا کہ ہم بھارت کے غلام نہیں بنیں گے۔

اب میرے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ والدہ صاحبہ بوڑھی تھیں اور ہماری اللہ رکھی سخت بیمار۔ کندھے پر اٹھاؤں تو کس کو۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ والدہ صاحبہ کو کندھے پر اٹھا لیتا ہوں مگر جب میں ان کی طرف بڑھا تو ضعیف رگوں میں جوانوں جیسا خون پلا۔ "نہیں میں ٹھیک ہوں' چلو تم اسے (ہماری اللہ رکھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اٹھا لو۔ وہ بیمار ہے" والدہ صاحبہ نے حکم دیا۔ میں اللہ رکھی کی طرف بڑھا کہ بے چاری کو سہارا دوں تو طعنہ ملا "شرم نہیں آتی؟ امی جی ابا جی اور پھر سارے قافلے والے کیا کہیں گے۔ میں ٹھیک ہوں تم بیٹوں کو سنبھالو۔ میری فکر نہ کرو"۔

"عجیب ہی سماں تھا۔ ہمارے پیچھے گولے تھے آگے پانی میں ڈوبی ہوئی فصلیں اور لمبے راستے اور انجانے فاصلے۔ گرتے پڑتے ہم سب گاؤں والوں کا قافلہ اب گاؤں سے ذرا دور ہو گیا تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کس طرف چلیں' آیا برکی کو چلیں یا کوریاں کو۔ یہ دونوں گاؤں تقریباً ایک ہی فاصلہ پر ہیں۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ برکی کی طرف سڑک نزدیک ہونے کی وجہ سے خطرہ زیادہ ہے اس لیے کوریاں گاؤں کی طرف چلا جائے۔ قافلے نے رخ اس طرف موڑ لیا۔ راستے کا کوئی خاص تعین نہ تھا۔ ہم ایک پگڈنڈی اور فصلوں میں سے گزر رہے تھے۔ قافلے میں ہر ایک دوسرے کو تسلی دے رہا تھا کہ تھوڑا فاصلہ رہ گیا ہے۔

راستے میں ہمارے قافلے میں اضافہ ہوتا گیا کیوں کہ دوسرے گاؤں کے لوگ بھی ہمارے قافلے میں شامل ہو رہے تھے۔ قافلہ کیا تھا بس لٹا پٹا سا کارواں تھا۔ راستے میں بچوں نے پانی کی خواہش کی جو مجبوری کی وجہ سے رد کر دی گئی۔ پانی تو کھیتوں میں بہت تھا مگر پینے کے قابل نہ تھا۔ کوریاں تک کا راستہ جو عام حالات میں دیہاتی لوگ پون گھنٹے میں طے کر لیا کرتے تھے آج ڈیڑھ گھنٹا گزرنے کے بعد بھی ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ عجیب

حالت تھی۔ جتنا ہم تیز دوڑتے یا چلتے تھے فاصلہ اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا تھا اور ہماری حالت یہ تھی کہ نہ واپس جا سکتے تھے نہ آگے۔ خدا کا شکر کیا جب دو گھنٹے بعد ہم کوریاں گاؤں کے چھپڑ پر پہنچے لیکن یہاں پہنچ کر ہماری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اس لیے کہ گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ کچھ بچے کھچے لوگ نظر آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ گاؤں والے تو کب کے گاؤں چھوڑ کر برکی چلے گئے ہیں۔

اب طے یہ پایا کہ کسی نہ کسی طرح نہر کو جلد از جلد عبور کیا جائے تاکہ بھارتی فوج کے ظلم سے محفوظ ہو جائیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اب یہاں سے برکی چلیں مگر کچھ جہاں دیدہ لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی اور سمجھایا کہ اب برکی کی طرف جانا حماقت ہو گی۔ یقیناً ہماری فوج نے برکی کا پل توڑ دیا ہو گا کیوں کہ فوری طور پر دشمن کو روکنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا اور پھر برکی گاؤں بھی خالی ہو گا۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ یہاں سے سیدھے پدری کے پل کو جانا چاہیے۔

اب قافلے کا رخ سیدھا نہر کی طرف تھا۔ وہاں سے نہر کم از کم ڈیڑھ میل دور ہو گی مگر ہمیں سیدھے راستے کا علم نہ تھا اور دوسرا راستہ کافی چکر کاٹ کر جاتا تھا لہٰذا جدھر سے جس نے چاہا نہر کی سمت منہ کر کے چل دیا۔ مجھے بھی چوں کہ کسی راستے کا علم نہ تھا لہٰذا اپنے گھر والوں کو ایک کچے راستے پر ڈال دیا اور چلتے گئے مگر راستہ لمبا ہوتا گیا۔ دراصل ہم غلط راستے پر تھے۔ گھنٹا بھر کے بعد معلوم ہوا کہ اصل راستہ تو پیچھے رہ گیا ہے۔ واپس ہوئے اور کافی تگ و دو کے بعد ٹھیک راہ پر آئے۔ دھوپ اب تیز ہو گئی تھی۔

وقت تقریباً گیارہ بجے کا تھا۔ بی آر بی ہمیں نظر آ رہی تھی مگر ہم ابھی تک نہر سے پرے تھے۔ بھارتی فوج کی گولا باری بدستور جاری تھی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور خستہ حالت میں تقریباً بارہ بجے بی آر بی نہر پر پہنچ ہی گئے۔

نہر کے قریب ہمیں اپنی فوج نظر آئی تو جان میں جان آئی کہ ہماری عزت کے رکھوالے موجود ہیں۔ نہر کے کنارے پر آج عجیب سماں تھا۔ بے شمار لوگ جلد از جلد نہر عبور کرنے کی کوشش میں تھے مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ سوائے ایک پدری پل کے اور کوئی راستہ نہ تھا اور وہ پل بھی لکڑی کا تھا اور ڈر تھا کہ اب گرا کہ گرا۔ گویا پل کیا تھا ایک پل صراط تھا جس کے نیچے بی آر بی نہر بہ رہی تھی۔ مشکل سے تقریباً ایک میٹر چوڑا تھا اور عام لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا تھا۔ اصل میں یہ پل آمد و رفت کے لیے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ اس واسطے بنایا گیا تھا کہ پدری گاؤں کی کچھ زمین برکی اور کوریاں کے ساتھ نہر کے دوسرے کنارے پر تھی۔ اس گاؤں سے برکی نہر کا پل تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا لہٰذا یہ مختصر سا پل تعمیر کر دیا گیا تھا تاکہ یہاں کے آمد و رفت کی کسانوں کو آسانی ہو۔

پل کے دونوں طرف ہمارے فوجی جوان کھڑے تھے۔ اب ان کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ لوگوں کو پل استعمال کرنے سے روک بھی نہیں سکتے تھے اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ پل ٹوٹ جائے کیوں کہ اس کے ٹوٹ جانے سے لوگوں کے لیے نہر عبور کرنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یہ تو اس پل کی ہمت تھی کہ سب کو اپنے سینے سے گزرنے کی اجازت دے رہا تھا۔

آخر پاک فوج کے جوانوں نے پل کا نظام سنبھالا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں پل سے گزریں وگرنہ اگر خدانخواستہ یہ پل بھی ٹوٹ گیا تو کوئی بھی نہ گزر سکے گا۔ پدری پل پر تقریباً بارہ بجے کے قریب ہماری باری آئی۔ جونہی میں نے بی آر بی کے لاہور والے کنارے پر قدم رکھا میرے سامنے 1947ء کا منظر گزر گیا' جب میں نے قافلے کے ساتھ کھالڑہ بارڈر کراس کیا تھا تو کسی نے کہا" پاکستان آ گیا ہے تھا" تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ آج یہ پانچ چھ گھنٹوں کا تکلیف دہ سفر پاکستان میں دوبارہ پیدائش سے کم نہ تھا۔

لاہور جانے سے پہلے ایک نظر میں نے نہر کی دوسری جانب ڈالی تو سوائے گرد و غبار کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ پھر میں نے اپنے شیر دل پاکستانی فوجیوں کی طرف دیکھا جو اب مکار دشمن کو موت کا راستہ دکھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب مجھے کوئی غم کوئی فکر نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دشمن کو مزہ چکھانا ہمارے جیالے اچھی طرح جانتے ہیں اور اب دشمن سوائے اپنی موت کے اور کسی جانب نہیں بڑھ سکتا۔

بچوں کے لیے

قرآن درس

جہاد

ڈاکٹر عبدالرؤف

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہوں پر جہاد کا حکم دیا ہے۔ جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جہاد عربی لفظ ہے۔ اس کا مادہ ہے' جہد' جس کے لفظی معنی ہیں "کوشش کرنا' ہمت کرنا" وغیرہ۔ دینی اور خصوصی معنوں میں جہاد اللہ تعالیٰ' اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے اور ہر قسم کی بدی کے خلاف کوشش کرنے کا نام ہے۔

صرف اس قسم کی صورتوں میں جہاد کی اجازت ہے:۔

(1) اسلام کی تبلیغ و تعلیم میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے۔

(2) کسی قسم کے ظلم اور ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے

(3) مسلمانوں یا غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لیے۔

جہاد مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ اس کی عام قسمیں یہ ہیں۔

(1) اخلاقی جہاد:

اس جہاد کا مقصد ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کے خلاف منظم کوشش کرنا ہے' مثلاً بے راہ روی' گناہوں' جرموں' رشوت ستانیوں' بدعنوانیوں' فحش ادب' گندی فلموں' رقص و سرود کے لچر پروگراموں وغیرہ کے خلاف ڈٹ جانا۔

(2) علمی جہاد:

اسلام کے خلاف غلط پروپیگنڈا یا کاروائیوں کے خلاف منظم کوشش کرنا بھی جہاد ہے۔ مخالفوں کی دلیلوں اور الزاموں کے معقول جواب دینا' غلط فہمیاں دور کرنا اور تبلیغ اسلام کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا علمی جہاد کی چند صورتیں ہیں۔

(3) جسمانی جہاد:

جسمانی جہاد اسلام کے دشمنوں کے خلاف ایک پاکیزہ اور کھلم کھلی جنگ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور برتری سے بغاوت ہو جائے' اسلام اور مسلمانوں کو خطرے لاحق ہو جائیں اور صورت حال اس قدر نازک ہو جائے کہ جسمانی تگ و دو اور باقاعدہ جنگ کے علاوہ علاج اور روک تھام کا کوئی اور راستہ موجود نہ ہو تو جسمانی جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کے چند اہم جہاد یہ ہیں۔

(1) کشمیر میں ہندو سامراج کے خلاف جہاد

(2) فلسطینی مسلمانوں کا یہودی طاقت کے خلاف جہاد

(3) چیچنی مسلمانوں کا روسی بربریت کے خلاف جہاد

(4) افغانستان میں سپر طاقتوں کے خلاف جہاد

(5) عراق پر بڑی طاقتوں کی وحشیانہ بم باری اور مہلک ناکہ بندیوں کے خلاف جہاد

(6) یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف سرب مسلمانوں کا جہاد..... وغیرہ وغیرہ۔

زبیدہ سلطانہ

افیمچی اور اس کے خادم

ایک امیر آدمی کو افیون کی بری لت پڑ گئی۔ دن رات افیون کی پینک میں پڑا اونگھا کرتا۔ اس بری علت کی وجہ سے لوگوں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ گھر میں بس ایک ملازم کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کا بھی یہ ہنجار تھا کہ مالک دن بھر غنودگی میں نیم مردہ سا پڑا رہتا' خادم ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا' رات کو واپس آجاتا۔

آقا کا حکم تھا کہ ایک سیر (کلو کے برابر) دودھ رات کو اسے ضرور پلا دیا کرے۔ ملازم بازار سے ایک سیر دودھ لے آتا۔ تین پاؤ مالک کو پلاتا اور پاؤ بھر خود پی جاتا۔ اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا کہ افیمچی کو سیر کے بجائے تین پاؤ دودھ پر ٹرخا دیا جاتا۔

ایک بار کسی وجہ سے افیمچی کو شبہ ہو گیا کہ اسے دودھ پورا نہیں ملتا۔ اس نے ایک اور ملازم رکھ لیا اور اسے تاکید کر دی کہ پہلے خادم پر نظر رکھے کہ وہ رات کو آقا کو پورا سیر بھر دودھ پلاتا ہے یا نہیں۔

اب پہلے خادم نے نئی تدبیر سوچی۔ وہ ایک پاؤ بھر دودھ نئے ملازم کو بھی دے دیتا' ایک پاؤ خود پیتا اور آدھا سیر آقا کو دیتا۔ کچھ عرصہ بعد افیمچی آقا کو پھر شبہ ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ ہیر پھیر کیا جا رہا ہے۔ اس نے خوب سوچ بچار کر کے ایک اور ملازم رکھ لیا اور اسے الگ بلا کر سمجھا دیا کہ اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ چپکے چپکے نگرانی کیا کرے کہ پہلے والے دونوں خادم مالک کو پورا دودھ پلاتے ہیں یا کچھ چکر چلاتے ہیں۔

پہلے والے خادم نے نئی مصیبت کا اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ پاؤ بھر دودھ نئے ملازم کو بھی دے دیا کرے اور باقی ایک پاؤ آقا کو پلا دے۔ اس طرح اس کے اپنے حصے میں تو کوئی کمی نہ ہوئی' بے چارے آقا کی خوراک کم ہوتی گئی۔

کچھ عرصہ اور اسی طرح گزر گیا۔ غذا کی کمی سے افیمچی کمزور ہوتا گیا۔ آخر اس نے اپنے آپ میں بہت نقاہت محسوس کی تو اسے پھر شبہ ہوا۔ مگر اس کے پاس تو بس ایک ہی ترکیب تھی کہ ایک نگران اور مقرر کرلے۔ اس کے علاوہ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی اس میں نہیں رہ گئی تھی۔ افیون کے نشے نے اس کے ذہن کو بے کار اور اسے جسمانی طور پر بھی کمزور اور بیمار کر دیا تھا۔

لیجئے چوتھا ملازم اور رکھ لیا گیا اور پہلے کی طرح اسے بھی پوری پوری جاسوسی کرنے کی تاکید کر دی کہ پہلے تینوں خادم کوئی چکر نہ چلانے پائیں اور آقا کو پورا دودھ پلائیں۔

اب ہوا یہ کہ رات کو چاروں خادم مزے سے گرم گرم دودھ کا ایک ایک کپ مزے سے ڈکار جاتے اور افیمچی کی مونچھوں کو ذرا سی ملائی لگا دیتے۔ صبح کو وہ نئے اور چوتھے نگران کو بلا کر پوچھتا۔

"کیوں بھیا! کیا ہم نے رات کو دودھ پیا؟"

خادم جواب دیتا۔

"جی حضور پیا۔ یہ دیکھیں مونچھوں کو ابھی تک ملائی لگی ہوئی ہے"۔ افیمچی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا اور تسلی کر کے کہتا...... "ٹھیک! ہاں ہاں پیا! پیا!" اور پینک میں چلا جاتا۔

* * *

ڈاکٹر ضوان ثاقب

دیوہنس
(Pelicans)

دیوہنس بڑے قدو قامت کے آبی پرندے ہیں۔ان کے پروں کا پھیلاؤ300 سینٹی میٹر تک اور وزن 7 سے 14 کلوگرام تک ہوتا ہے۔ یہ جھنڈوں میں رہتے ہیں۔ان کی پرواز کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ان کی ایک بہت اہم خاصیت ان کی چونچ کے نیچے ایک بڑی جلد کی تھیلی ہوتی ہے۔اس تھیلی میں وہ شکار کے دوران میں پانی میں سے مچھلیاں پکڑ کر جمع کرتے ہیں۔اس تھیلی کا حجم اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس میں 13 لیٹر پانی سما سکتا ہے۔

دیوہنس ایک شکاری پرندہ ہے اور اس کے شکار کرنے کا انداز دیگر پرندوں سے بہت مختلف اور انوکھا ہے۔ کم گہرے پانیوں میں شکار کرتے وقت کئی دیوہنس مل کر اپنے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی خوف ناک آواز پیدا کرتے ہیں۔وہ اس پھڑپھڑاہٹ کے ذریعے مچھلیوں کو ڈرا کر کسی کونے میں جمع کر لیتے ہیں پھر بیک وقت ان پر شکار کی خاطر جھپٹتے ہیں اور مچھلیاں دھڑا دھڑ شکار کر کے اپنی چونچ کے نیچے موجود تھیلی میں جمع کرتے چلے جاتے ہیں۔

دیوہنس پوری دنیا میں بڑی بڑی جھیلوں اور سمندروں میں ہی ملتے ہیں۔پاکستان میں مندرجہ ذیل تین قسموں کے دیوہنس دیکھنے میں آئے ہیں۔ مشرقی سفید دیوہنس سلیٹی دیوہنس دلمیش دیوہنس

مشرقی سفید دیوہنس کے پر زیادہ تر گلابی سفید ہوتے ہیں۔ سینے کے بال کسی قدر زردی مائل سفید ہوتے ہیں۔ یہ رن کچھ کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ موسم سرما میں نقل مکانی کر کے سندھ ' بلوچستان اور شمالی بھارت کی جھیلوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔افریقہ اور یورپ میں بھی اس قسم کے دیوہنس ملتے ہیں۔ سلیٹی دیوہنس برصغیر کا مقامی پرندہ ہے اور یہ معمولی نوعیت کی نقل مکانی کرتا ہے۔اس کے سر 'گردن اور پروں کا رنگ سلیٹی ہوتا ہے۔اوپر کے جبڑوں پر نیلے رنگ کے دھبوں کی قطار ہوتی ہے۔ چونچ کے نیچے جھلی کا رنگ کاسنی ہوتا ہے جس پر نیلے رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ دلمیش دیوہنس کے پروں پر سلیٹی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ البتہ بڑے پروں کا رنگ سیاہ بھورا ہوتا ہے۔ ٹانگیں اور پنجے بھی گہرے سلیٹی رنگ کے ہوتے ہیں۔ سندھ میں ماہی گیر رسی سے باندھے ہوئے دیوہنسوں کو یا ان کی کھال کو سر پر رکھ کر پانی میں تیرتے ہوئے خاموشی سے بطخوں کے قریب جا پہنچتے ہیں اور وہ انہیں ٹانگ سے پکڑ کر نیچے پانی میں کھینچ لیتے ہیں۔یوں وہ ان کو کامیابی سے شکار کر لیتے ہیں۔

دیوہنس گروہوں میں بگلوں کے ساتھ مشترکہ جگہوں پر پانی کے قریب جھاڑیوں میں گھونسلا بناتے ہیں ان کے گھونسلے بڑے اور دائرہ نما ہوتے ہیں۔ گھونسلے میں مادہ تین یا چار انڈے دیتی ہے۔ان انڈوں کو 30 دن تک سینے کے بعد بچے نکل آتے ہیں۔

محمد قاسم سردیا

انٹرنیٹ

(INTERNET)

انٹرنیٹ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا کمپیوٹر نیٹ ورک ہے۔ انٹرنیٹ کو بعض اوقات صرف نیٹ (NET) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتنی حیرانی والی بات ہے کہ انٹرنیٹ کا کوئی مرکزی دفتر یا ہیڈ کوارٹر ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کو رواں دواں رکھنے کے لیے رضاکار (Volunteers) دن رات کام میں لگے رہتے ہیں۔

پچھلے چند سالوں سے انٹرنیٹ کے استعمال میں بہت تیزی آئی ہے اور ہر روز لاکھوں (Millions) افراد نیٹ سے منسلک ہو رہے ہیں۔

انٹرنیٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ 1994ء تک تین ملین افراد نیٹ سے منسلک تھے جو 1997ء میں بڑھ کر 100 ملین افراد ہو گئے۔ ایک سروے کے مطابق 2001ء کے آخر تک یہ تعداد مزید بڑھ کر 280 ملین ہو جائے گی۔

1950ء کی دہائی میں امریکا کے محکمہ دفاع نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ایک چھوٹا سا بم ان کے کمپیوٹرز اور ڈیٹا کو مکمل طور پر تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اس خطرہ کے پیش نظر انہوں نے RAND کارپوریشن کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ایک کمپیوٹر کے بجائے مختلف جگہوں پر پڑے ہوئے کمپیوٹرز کا ایسا نیٹ ورک بنایا جائے کہ آپس میں سب کا رابطہ بھی رہے اور ڈیٹا یا انفارمیشن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسفر بھی کیا جا سکے۔

ایک کمپیوٹر کو دوسرے کمپیوٹر کے ساتھ ملانے (Link) کے اس سارے مرحلے کو سوئزر لینڈ کے ماہر طبیعیات ڈاکٹر ٹم برنرزلی (Dr.Tim Berners Lee) نے مکڑی کے جالے (Web) سے تشبیح دی۔ اسی نسبت سے اس سارے نظام کو World Wide Web یا صرف (WWW) کہا جاتا ہے۔

پوری دنیا کے کمپیوٹرز کو نیٹ کے ذریعے آپس میں رابطہ (Link) رکھنے میں Tcp/IP (Transmission Control Protocol/ Internet Protocol) ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اس کے بغیر ہم انٹرنیٹ کو استعمال کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ Tcp/IP ایک ایسا سافٹ ویئر یا پروگرام ہے جو نیٹ استعمال کرنے والے کمپیوٹرز کو آپس میں ابلاغ (Communicate) کرنے کی اجازت فراہم کرتا ہے۔

ایڈریس لکھنے کے بعد جیسے ہی ویب سائٹ کھلتی ہے اس پر Link کو بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر سکرین پر جو منظر نظر آرہا ہوتا ہے اس کو ویب سائٹ کہتے ہیں۔ اور لنک (Link) کے ذریعے ہم ایک سائٹ سے دوسری متعلقہ سائٹ (Site) میں آسانی سے جا سکتے ہیں۔

یہ لنک Link کلرڈ ٹیکسٹ (Colored Text) کی صورت میں ہوتا ہے۔ جسے ہائپر ٹیکسٹ (Hyper Text) کہا جاتا ہے یا پھر یہ ایک آئی کون (I Con) یا امیج (Image) کی صورت میں ہوتا ہے جسے ہائپر ریجن (Hyper Region) کہتے ہیں۔

1993ء میں مارک اینڈرسن (Mark Anderson) نامی ایک طالب علم نے انٹرنیٹ کے لیے ایک نئی چیز براوزر (Browser) ایجاد کی۔ براوزر ایک ایسا سافٹ وئیر ہے جس کے ذریعے ہم بڑی آسانی سے کمپیوٹر کے ذریعے انٹرنیٹ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے براوزر کو موزیک (Mosiac) کا نام دیا گیا۔ آج کل سب سے زیادہ استعمال ہونے والے براوزر میں نیٹ اسکیپ نیوی گیٹر (Net Scape Navigater) اور مائیکرو سافٹ انٹرنیٹ ایکس پلورر (Micro Soft Internet Explorer) زیادہ اہم ہیں۔

انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لیے کمپیوٹر ماڈم (MODEM) اور اس سے متعلقہ سافٹ وئیر، ٹیلی فون کنکشن، انٹرنیٹ سروس پروائیڈ اور براوزر کی ضرورت ہوتی ہے۔

ماڈم ایک ایسا ہارڈ وئیر ہے جو کمپیوٹر کی ڈیجی ٹل لہروں کو (Analog Waves) میں اور پھر دوبارہ ڈیجی ٹل لہروں میں تبدیل کرتا ہے۔

یعنی کی بورڈ (Key Board) کے ذریعے ہم جو بھی دیتے ہیں وہ سکرین پر آؤٹ پٹ کی صورت میں ہمیں نظر آرہی ہوتی ہے۔ اگر ہم انٹرنیٹ سے منسلک ہیں تو ماڈم ہماری لکھی ہوئی تحریر کو اینالاگ لہروں میں تبدیل کر کے فون لائنوں کے ذریعے ہمارے مطلوبہ کمپیوٹر تک پہنچا دے گا۔ دوسرے کمپیوٹر میں لگا ہوا ماڈم اس پیغام یا تحریر کو دوبارہ ڈیجی ٹل فارم میں تبدیل کر دے گا اور اس کمپیوٹر پر وہ تحریر لکھی ہوئی نظر آئے گی۔ چاہے وہ کمپیوٹر دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔

آئی ایس پی (Internet Service Provider) ایک ایسی کمپنی ہوتی ہے جو مقررہ فیس کے بدلے میں مخصوص عرصے کے لیے ہمیں انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ جیسے ہی ہماری فیس ختم ہو جائے گی ہمارا نیٹ سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔

تمام انتظامات مکمل ہونے پر جب آپ انٹرنیٹ اوپن کرتے ہیں تو سب سے پہلے کھلنے والی ویب سائٹ (Web Site) کو ہوم پیج (Home Page) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہوم پیج کھلنے پر سب سے اوپر نظر آنے والی پٹی کو ویلکم بینر (Well Come Banner) کہتے ہیں۔ اس کے نیچے مینو (Menue) کی پٹی ہوتی ہے۔ جسے (Pull Down Menu) کہتے ہیں۔

ان دونوں کے نیچے ایک سفید رنگ کی پٹی ہوتی ہے جس میں کسی کی مطلوبہ ویب سائٹ کا ایڈریس لکھا جاتا ہے۔ اس کو Uniform Resource Locator یا (URL) اور بعض اوقات ایڈریس ونڈو کہا جاتا ہے۔

ہر ویب سائٹ کا ایڈریس پروٹوکول Hypertent Transfer Protocol (HTP) سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد WWW پھر کمپنی یا ویب سائٹ کا مخصوص نام درج کیا جاتا ہے اور آخر ڈومین لکھی جاتی ہے۔ مثلاً

www.Pakwatan.com

استعمال ہونے والے چند مشہور ڈومین:

Com - For Commercial

Edu - For Educational

Org - For Organization

Net - For Network

Gov - For Government

Mil - For Miltry

آیئے دوست بنائیں

محمد زبیر امین 13 سال
مطالعہ
اسماعیل زئی کالونی گلی نمبر 2 نزد
عید گاہ شاہ بدر روڈ ملتان

محمد سلیم دانش 15 سال
کرکٹ
عبدالستار مسالا فروش صابر
بازار ٹانک

عامر شہزاد 16 سال
کرکٹ
عثمان شریف ڈاک خانہ ہرن
پور پنڈ دادن خان، جہلم

مزمل الطاف 15 سال
معلومات اکٹھی کرنا
چک منیر آباد ڈاک خانہ اللہ
آباد تحصیل شجاع آباد ملتان

ندیم اختر نصیری 15 سال
ناول پڑھنا
معرفت مجید دکان دار مہندی محلہ
گلی 7 منظور پارک فیصل آباد

جواد ظفر بٹ 10 سال
وڈیو کھیلنا
ظفر شجاع الدین بٹ عقب سول
ہسپتال قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ

محمد وقاص بشیر 14 سال
فٹ بال کھیلنا
399 ڈی سیکٹر ٹو خیابان سرسید
راول پنڈی

محمد نعیم 16 سال
پینٹنگ
مکان 297 بی 7 نیو فروٹ
مارکیٹ ساہی وال

عمر خان 14 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
خان الیکٹرک اسٹور، آر اے
بازار لاہور

محمد اویس اظہار 16 سال
قلمی دوستی
محمد پورہ چک 174 تحصیل
ضلع شیخوپورہ

محسن علی چودھری 14 سال
فٹ بال کھیلنا
مکان 2 گلی 3، ایکس بلاک نیو
سٹیلائٹ ٹاؤن سرگودھا

ذوالفقار علی 15 سال
حفظ کرنا
مکان 194 کیو، واپڈا کالونی گڈو
کشمور

کاشف اعجاز 13 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
اعجاز میڈیکل اسٹور ڈنگہ
گجرات

زخرف ممتاز 13 سال
کرکٹ
مکان 1563۔ آئی۔ ٹن۔
ون اسلام آباد

اشعر کھتری 12 سال
تیراکی
حاجی ایوب مینشن فلیٹ نمبر
4 اے ریور روڈ کراچی

علی رضا خالد 15 سال
کمپیوٹر چلانا
1۔ سی چناب روڈ واہ چھاؤنی

جنید علی 12 سال
کمپیوٹر چلانا
مکان 71 ڈی بالمقابل ڈی سی
ہاؤس آفیسرز کالونی بہاول پور

نوید انور 16 سال
کرکٹ
153 گ ب بلکن ٹوبہ ٹیک
سنگھ

محمد زبیر 14 سال
کمپیوٹر چلانا
930 بی ممتاز آباد ملتان

کاشف علی میراں 13 سال
قلمی دوستی
مکان 194 گلی 8 نئی
آبادی کوٹ رادھا کشن

شفقت رسول پرنس 16 سال
قلمی دوستی
غلام رسول وارڈ سرونٹ تحصیل
ہیڈ کوارٹر ہسپتال لیاقت پور

عامر رانا 14 سال
کرکٹ
رانا پور ڈاک خانہ علی پور تحصیل
وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ

آیئے دوست بنائیں

کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام ..... عمر .....

مشاغل .....

پتا .....

کالو میرا دوست

شبانہ یونس

ہمارے خانہ بدوش کیمپ میں چوری ہو جائے گی' یہ کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا مگر صبح جب ڈیرے کے لوگ سو کر اٹھے تو ہماری روزی روٹی کمانے کے ذریعے چوری ہو چکے تھے۔ ہم خانہ بدوشوں کے لیے ریچھ بندر اور بکرے اپنی اولاد سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ ہم اپنے جانوروں کی بڑی سخت تربیت کرتے ہیں۔ جنگلی ریچھ یا بندر کو سدھنے کے لیے سال چھ مہینے درکار ہوتے ہیں۔ ہم انہیں قلا بازی لگانے' صاحب کی طرح کرسی پر بیٹھنے' سلام کرنے اور بچوں کو ہنسانے کی تربیت دیتے ہیں۔ کبھی مار پیٹ خصوصاً چھڑی سے اور کبھی روٹی یا کوئی اور کھانے والی چیز انعام میں فراہم کر کے ہم جانور کو ماہر کرتے ہیں۔ اس تربیت کی تکمیل کے بعد ہم اپنے اپنے جانور کو لے کر گلی محلے میں ڈگڈگی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کرتے ہیں۔ بڑے بچے سب متوجہ ہوتے ہیں۔ بچوں کو تماشے سے دل چسپی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ بندر یا بھالو والے کو تماشا دکھانے کے لیے کہتے ہیں۔ یوں ایک دو بچوں کی فرمائش پر ہم اپنا جھولا (تھیلا) رکھ کر ڈگڈگی کی آواز اور چھڑی کے اشارے پر اپنے ریچھ یا بندر کو نچانے کا آغاز کرتے ہیں۔ محلے اور گلی کے بچوں کے علاوہ راہ گیر بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں مختلف قسم کے کرتب کا شو ہوتا ہے۔ بندر عجیب آوازیں نکالتا ہے' دانت نکالتا ہے۔ بکرا پانچ منزل کے چھوٹے چھوٹے بلاک پر چاروں پیروں سے مہارت سے کھڑا ہو کر دکھاتا ہے۔ بچے حیرانی سے چھوٹے سے بکرے کی مہارت دیکھتے ہیں۔ بندر اپنے سر ٹوپی اتار کر اس میں بچوں بڑوں سے انعام وصول کرتا ہے۔

بچے اپنے اپنے گھروں سے روپیا دو روپے یا روٹیاں آٹا پرانے کپڑے یا جوتے وغیرہ لا کر بندر والے کو دیتے ہیں۔ جب سے آٹا مہنگا ہوا ہے' گھر والے آٹا دینے سے گریز کرتے ہیں۔ بس چند روپے دے کر ٹرخا دیتے ہیں۔ یوں ہر تماشے سے بندر والے کو بہت کم آمدنی ہوتی ہے۔ اپنے دن بھر کی کمائی سے اسے اپنے جانوروں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے' اپنے بیوی بچوں کو پالنا ہوتا ہے۔ کچھ بچت ہو جائے تو عید یا شادی بیاہ کے لیے کپڑے یا جوتے لینا ہوتے ہیں یا پھر بیماری کی صورت میں کسی حکیم یا جوگی بابا سے بیماری کا علاج کرانا ہوتا ہے۔

کئی دنوں سے کچھ مشکوک لوگ ہمارے کیمپ کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ دو آدمیوں نے چاچا رحیم بخش سے

پوچھا بھی تھا۔ ”تمہارے کیمپ میں کتنے ریچھ‘ کتنے بندر اور کتوں کی تعداد کتنی ہے؟“

چاچا سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اس نے بتادیا کہ کیمپ میں کل تین ریچھ ہیں‘ ان میں ایک بھورا اور دو کالے ہیں۔ یہ ہمارے سدھائے ہوئے ریچھ ہیں۔ اس کے علاوہ چھ بندر سیکھے ہوئے اور چار زیر تربیت ہیں۔ پچاس گدھے اور چھ بکرے اور پانچ کتے ہیں۔ ایک اسپیشل کتا کالو ہے۔

میرے ابو ایک دفعہ کسی کوٹھی میں تماشا دکھانے گئے۔ جب وہ واپس آرہے تھے تو سڑک کے کنارے چند بچے ایک کتے کے ننھے منے بچے کو پتھر مار رہے تھے۔ ابا نے ڈانٹا ”بے شرمو! بے زبان جانور کو تنگ کروگے تو تمہاری بخشش کیسے ہوگی“۔

یہ سن کر شریر بچوں نے چڑ کر ایک پتھر اٹھا کے بندر کو بھی دے مارا اور بھاگ گئے۔ ابا نے کتے کے پلے کو یہ کہتے ہوئے اٹھا لیا۔ ”ہاں مجھے اس کی ضرورت ہے اور اس بے چارے کو میری مدد چاہیے“۔

کیمپ میں لا کر اسے روٹی پانی دیا۔ اس دن سے کالو ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بڑا پیار کرنے والا سمجھ دار کتا تھا۔ جس دن وہ مشکوک آدمی کیمپ سے ہو کر گئے‘ اگلی رات زور دار آندھی آئی۔ سب اپنے اپنے تنبو میں بال بچوں کے ساتھ دبکے ہوئے تھے۔

بار برداری کے لیے استعمال ہونے والے گدھوں کو ہم باندھ کر نہیں رکھتے‘ نہ ہی کتوں کو باندھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ریچھ بندر اور بکرے اپنے اپنے کھونٹے سے بندھے ہوتے ہیں۔

آدھی رات کے بعد کچھ لوگ آئے۔ جانے کس دوائی کا انہوں نے ریچھ اور بندروں پر سپرے کر کے انہیں بے ہوش کیا۔ پھر ان کے کھونٹوں سے رسیاں کاٹیں اور ٹریکٹر پر لاد کر لے گئے۔ صبح ہوئی تو ڈیرے والوں کو پتا چلا۔ تین ریچھ اور کئی بندر چوری ہو چکے تھے۔ چاچا رحیم بخش کو پتا چل گیا کہ وہ دونوں مشکوک آدمی کسی سرکس کے لیے ان کے جانور چوری کر کے لے گئے ہیں۔ کیمپ کے بڑے بوڑھوں نے کانفرنس کر کے تھانے جا کر رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ کیا۔

اب کسی کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ایک بندر کا بچہ ہی خرید لے۔

اگلی صبح تک جانوروں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ سب کو حیرانی تھی۔ کالو بھی غائب تھا۔

اگلی شام کالو آگیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی وہ درخت کے نیچے سو گیا۔ ہمارے بڑے بوڑھے سر جوڑ کر بیٹھے۔ ان میں ایک کھوجی بھی تھا۔ دادا نے کھوجی سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ان کے جانوروں کا پتا معلوم کر دے گا تو وہ چندہ اکٹھا کر کے اسے سو روپے معاوضہ دیں گے۔

اللہ دتے نے پیار سے کالو سے پوچھا ”میرے چندا تمہیں کچھ خبر ہے کہ ہمارے جانور کون ظالم ڈاکو لے گیا“۔

کتے نے بھونک کر اظہار خیال کیا‘ جیسے کہ رہا ہو کہ ”ہاں مجھے پتا تو ہے“

وہ بے حد سمجھ دار کتا تھا۔ وہ اللہ دتے کی قمیص کا دامن پکڑ کر کھینچنے لگا۔ دتے نے کھوجی سے کہا ”مجھے لگتا ہے‘ کالو کو پتا ہے کہ ڈاکو ہمارے جانور کہاں لے کر گئے ہیں“۔

دراصل ڈاکو جب بے ہوش کر کے جانوروں کو لے جا رہے تھے تو وفادار کالو نے ان کا پیچھا کیا۔ اسی لیے وہ اتنی دور سے گرتا پڑتا واپس آیا تھا اور اب وہ اپنے مالک سے وفاداری کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔

"کالو کھوجی کو لے جاؤ اور جانوروں کا پتا چلاؤ"۔ دتے نے کہا۔

کیمپ میں ایک ٹوٹی پھوٹی بائی سکل تھی۔ کھوجی بائی سکل پر سوار ہو گیا۔ کتے نے دوڑ لگائی۔ اسے پتا تھا کہ فاصلہ زیادہ ہے۔

کھوجی نے بائی سکل پیچھے لگا دی۔ دو تین گھنٹے کے سفر کے بعد شہر سے باہر نئی آبادی میں بنے ایک بے آباد مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ پھر وہ بے چینی سے مکان کے گرد چکر لگانے لگا۔ ایک بڑے سے کمرے میں تینوں ریچھ الگ الگ بند تھے۔ ایک پنجرے میں سارے بندروں کو انہوں نے قید کر رکھا تھا۔ آزاد رہنے والے جانور غصے میں اندر چکر لگا رہے تھے۔ کھوجی نے کھڑکی سے جھانکا۔ "ارے یہ تو اپنے اللہ دتے کا ہیرو بندر بھی چوری کر کے لے گئے ہیں۔"

پانچ چھ لفنگے سے نوجوان کھانے پینے کے دوران میں اونچی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے "کل شام تک تمام جانوروں کو سرکس کے مالک کو بیچ دیں گے" ایک کہہ رہا تھا "ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے ایسا نہ ہو پولیس ہمیں دھر لے"۔

مفت کا مال ہاتھ آنے پر وہ بہت خوش تھے۔ "ایک لاکھ روپیا ان تربیت یافتہ جانوروں کا مل جائے گا۔ جنگل اور پہاڑوں سے پکڑے گئے جانوروں کا تو کسی نے بیس ہزار بھی نہیں دینا تھا"۔

وہ آپس میں پیسے بانٹنے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

کھوجی اور کالو نے فوری طور پر کیمپ کا رخ کیا اور سب کو ڈاکوؤں کے ٹھکانے کا بتایا۔ پھر چار پانچ مردوں کے ساتھ اللہ دتے نے تھانے کا رخ کیا اور ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر کو کھوجی اور کالو کے کارنامے کا بتایا۔ تھانے دار نے فوری طور پر اپنے بڑے افسر سے شام کو چھاپہ مارنے کے لیے بیس چھاپہ ماروں کی ٹیم طلب کی۔

کھوجی اور کالو کی رہ نمائی میں اس ویران کوٹھی پر چھاپہ مار کر جانور چوروں کو ڈرامائی انداز میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مکان کے پچھواڑے چوڑی کا ٹریکٹر بھی کھڑا تھا۔ پولیس کی نگرانی میں اسی ٹریکٹر پر بھوکے پیاسے جانوروں کو رکھوا کر کیمپ پہنچایا گیا جہاں سے وہ اصل مالکوں کے پاس پہنچ گئے۔

خانہ بدوش کیمپ کے ماحول میں جانوروں کی واپسی پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بے زبان جانوروں کے لیے سب سے پہلے کھانے اور پانی کا بندوبست کیا گیا۔ پھر باہم مشورہ کر کے انہوں نے مٹھائی کا ڈبہ تھانے میں پہنچایا۔ تھانے دار نے کہا۔

"شاباش کے مستحق تو کالو اور کھوجی ہیں جن کی وجہ سے ہم بروقت کارروائی کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ورنہ وہ بدمعاش تو اب تک لوگوں کے ہزاروں جانور چوری کر کے کھا پی چکے ہیں۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ان ڈاکوؤں کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام مقرر تھا۔ اب یہ رقم کالو اور کھوجی کو آدھی آدھی ملے گی"

"کیوں ٹھیک ہے یار" اللہ دتے نے کہا۔ کالو چلایا "بھوں بھوں"

"ہے تو کالا مگر بڑا پیارا ہے یار تو" دتے نے اسے تھپکا۔

این الطاف

کھیلوں کی دنیا

قسط 22

کرکٹ کیا اور کیسے؟

گزشتہ سے پیوستہ

سلپ کیچ:-

سلپ کیچ بلے باز کے نزدیک کھڑے ہو کر کرنے والے کیچ کو کہتے ہیں۔ کیچ کی اس قسم میں سب سے مشکل اور اہم بات یہ ہے کہ فیلڈر کو یہ اندازہ ہو کہ اسے کہاں اور کتنے فاصلے پر سلپ میں کھڑے ہونا ہے۔ یہ اندازہ چند گیندوں کے بعد وکٹ کی نوعیت اور بولر کے گیند کی رفتار سے ہو جاتا ہے۔

عام طور پر فیلڈنگ میں یہ غلطی کی جاتی ہے کہ فسٹ سلپ کا فیلڈر زیادہ تر وکٹ کیپر کے پیچھے چھپا رہتا ہے اور سیکنڈ سلپ اور گلی (Gully) کے فیلڈر اپنی جگہ سے ذرا دور کھڑے ہوتے ہیں۔ فسٹ سلپ کی پوزیشن یہ ہے کہ "ریڑن کریز" کی لائن میں اس کا بایاں پاؤں' دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے بلے باز کی صورت میں' ہونا چاہیے۔ باقی سلپ فیلڈروں کو ایک قوس کی شکل میں ایک دوسرے سے دو بازوؤں کی لمبائی کے فاصلے پر کھڑا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ نئی گیند وکٹ پر گر کر ذرا تیزی سے نکلتی ہے اور نئی گیند کا سلپ میں کیچ نکلنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اس لیے نئی گیند کے استعمال کے دوران میں سلپ فیلڈر کو ذرا ہٹ کر تھوڑا سا دور کھڑے ہونا چاہیے۔ گیند جوں جوں پرانی ہوتی جاتی ہے اس کی رفتار وکٹ پر گر کر آہستہ ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے گیند کے پرانے ہونے کے ساتھ سلپ فیلڈر بھی سلپ میں گیند کے مطابق آگے بڑھتا جائے۔ یعنی گیند جوں جوں پرانی ہوتی جائے گی ویسے ہی سلپ فیلڈر کی پوزیشن بھی آگے بڑھتی جائے گی اور وہ بلے باز کے نزدیک ہوتا جائے گا۔

سیکنڈ سلپ فیلڈر بہ نسبت فسٹ سلپ فیلڈر کے بیٹ کے زیادہ نزدیک ہونا چاہیے کیوں کہ سیکنڈ اور تھرڈ سلپ میں صرف وہی بال اٹھتے ہیں جو کہ بجائے بیٹ کے انتہائی کونے سے لگنے کے بیٹ کے دبیز حصے سے لگ کر جاتے ہیں جس سے کہ گیند کی رفتار نسبتاً کم ہو جاتی ہے اور گیند سیکنڈ اور تھرڈ تک پہنچتے ہوئے ذرا نیچے ہی رہتی ہے۔ ایسا ہی گلی (Gully) کی پوزیشن کا حال ہے لیکن ایسے بلے باز کے لیے جو زیادہ کٹ شاٹ (Cut Shot) کھیلنے کا عادی ہو اس کے اس شاٹ پر کیچ کے لیے بے شک آپ گلی فیلڈر کو ذرا پیچھے بھی کھڑا کر سکتے ہیں تاکہ اسے

سلپ کیچ

شارٹ لیگ کیچ

گیند کے پہنچنے تک اتنا وقت مل جائے کہ وہ صحیح پوزیشن میں آکر اسے کیچ کر سکے۔

ہر گیند پر چاہے اس پر اسٹروک کھیلا جائے یا نہ کھیلا جائے ایک سلپ فیلڈر کو اسے کیچ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یعنی ہر گیند پر توقع ہونی چاہیے کہ وہ اس کے پاس آئے گی' اس کے لیے بہترین اصول یہ ہیں:

(i) فیلڈر کو ذرا جھک کر اس طرح کھڑا ہونا چاہیے کہ دونوں ٹانگیں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر ہوں

(ii) جسم کا وزن دونوں پاؤں پر ایک جیسا ہو

(iii) جسم کا توازن قائم رکھنے کے لیے وزن پاؤں کے اگلے حصے پر زیادہ ہو

(iv) ایڑیاں زمین سے قدرے اٹھی ہوئی ہوں

(v) فیلڈر آگے کو جھکا ہوا ہو تاکہ بوقت ضرورت چھلانگ یا ڈائیو لگا کر کیچ کر سکے نیز وہ کیچ بھی جو کہ تھوڑا سا نیچے یا آگے کرنے والا ہو اور بظاہر اس کی پہنچ سے باہر ہو دبوچا جا سکے۔

(vi) سب سے اہم بات یہ ہے کہ سلپ فیلڈر کو گیند آنے سے پہلے اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلنا چاہیے اور خاص طور پر اپنی جھکی ہوئی پوزیشن سے اس وقت تک نہیں اٹھنا چاہیے جب تک کہ گیند اونچی اس کی طرف نہ آ رہی ہو۔

فسٹ سلپ فیلڈر عام طور پر گیند کو بولر کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی اپنی نگاہ میں رکھتا ہے مگر سیکنڈ تھرڈ سلپ اور گلی فیلڈر بیٹ کے کونے پر زیادہ دھیان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات فیلڈر کے اپنے انداز اور سہولت پر منحصر ہے۔

اس طرح لیگ سلپ یا شارٹ لیگ فیلڈروں کی زیادہ تر توجہ بلے باز کے پاؤں اور بلے پر ہوتی ہے۔ لیگ سلپ فیلڈر اگر گیند کو بولر کے ہاتھ سے نکلتے ہی نگاہ میں رکھے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ فسٹ سلپ کا فیلڈر کرتا ہے۔

شارٹ لیگ اور سلی مڈ آف فیلڈر جو کہ بلے باز کے بہت ہی نزدیک کھڑے ہوتے ہیں' ان کو اپنی پوزیشن پر کھڑا ہونے سے پہلے بلے باز کو باؤلنگ کی قسم' کھیل اور وکٹ کی حالت اور دوسرے متعلقہ کوائف کا مطالعہ کر کے اپنی پوزیشن لینی چاہیے۔ ایک ایسی وکٹ پر جہاں کہ بولر کو گیند سپن کرنے میں مدد مل رہی ہو اور جہاں بلے باز کو اپنی وکٹ بچانے کے لیے مشکل پیش آ رہی ہو' ایسے حالات میں فیلڈر کو بلے باز کے اور بھی نزدیک آ کر کھڑا ہونا چاہیے اور سلپ میں ہمیشہ ایسے مقام پر کھڑا ہونا چاہیے جہاں کھیلے جانے کے بعد گیند اس کے پاس اتنی اونچی پہنچے کہ وہ اسے باآسانی کیچ کر سکے۔

اچھی بیٹنگ وکٹ پر سلی مڈ آف اور فارورڈ شاٹ لیگ فیلڈر کو شارٹ ایکسٹرا کور اور شارٹ مڈ آن پوزیشن پر آ کر کیچ کا انتظام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ کسی سخت وکٹ پر گیند اکثر بلے کے درمیانی حصہ سے کھیلی جائے گی اور تیزی کے ساتھ ذرا اونچی ان کی طرف آئے گی۔ اس لیے ذرا دور کھڑے ہونے سے انہیں اتنا وقت مل جائے گا کہ وہ باآسانی کیچ کر سکیں۔ اس کیچ کرنے کے دوران میں سر اور آنکھوں کو صحیح اپنی جگہ پر ساکن رکھنا بہت ہی ضروری اور اہم بات ہے کیوں کہ اس طرح نظر گیند پر آخری وقت تک قائم رہتی ہے۔ (باقی آئندہ)

شرارتی لکیریں
شاہد
ریاض
شاہد
جلدی کرو بارات
پہنچنے والی ہے
1
2
یہ ہے، جیب کتروں سے
بچنے کا صحیح طریقہ
چلو کسی نہ کسی ہاتھ
پر تو گرے گا......
ایک "بندوق"
سے دو شکار

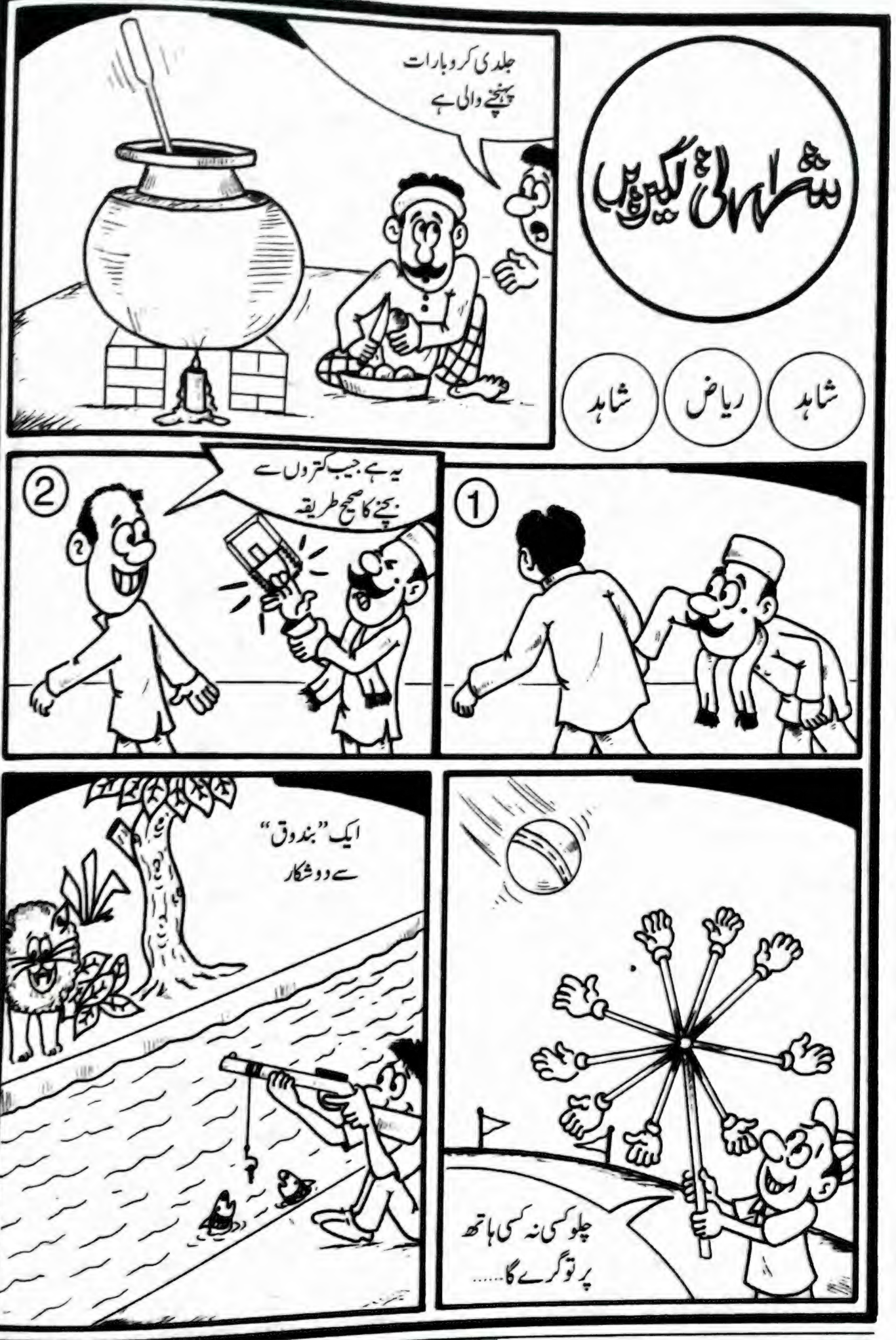

ہونہار مصور

ہمارا پرچم، پیارا پرچم

شاہد اقبال اوکاڑہ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

عثمان رزاق مظفر گڑھ (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

مزمل حسین اکمل نون روڈہ (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

مبشرہ اقبال سرگودھا (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

عائشہ جاوید نجوال چھاؤنی (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

حاجی محمد فیروز جھنگ صدر (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:- ماریہ شکور لاہور۔ محمد طلحہ عرفان کراچی۔ عثمان رزاق فیصل آباد۔ آصف بشیر پشاور۔ شعیب اقبال راوٗلا ہور۔ آمنہ حنیف فیصل آباد۔ سیدہ انعم گوجرانوالہ۔ محمد کاشف صدیقی جھنگ۔ زنیرہ مظفر کھاریاں چھاؤنی۔ معصومہ بشیر مظفر آباد۔ لبنیٰ رزاق فیصل آباد۔ میمونہ بشیر احمد مظفر آباد۔ گل فردوس ٹیکسلا۔ محمد فرقان اشرف سیال کوٹ۔ محمد ریحان خالد لاہور۔ ضیاء الرحمان لاہور۔ کوثر عزیز لاہور۔ عبدالباسط اسلام آباد۔ محمد شعیب ملتان۔ عمر فاروق باہری پور۔ فیصل نواز اوکاڑا۔ آئمہ سلیم راول پنڈی۔ مہ وش اصغر گوجرانوالہ۔ سعدیہ انجم راول پنڈی۔ ثمین سحر جھنگ۔ راحیل جعفر لاہور۔ ولید علی خان پشاور۔ عائشہ وحید اسلام آباد۔ رئیس جعفر لاہور۔ ساجدہ نورین ڈھوک کالا خان۔ صائمہ نورین پشاور۔ حسن اشرف جھنگ۔ حسن خورشید ملتان چھاؤنی

اکتوبر کا موضوع: گندم پیسنے والی چکی — آخری تاریخ 7 ستمبر

نومبر کا موضوع: مصور پاکستان — آخری تاریخ 7 اکتوبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

سائنس فکشن

مُردہ زندہ ہوگیا

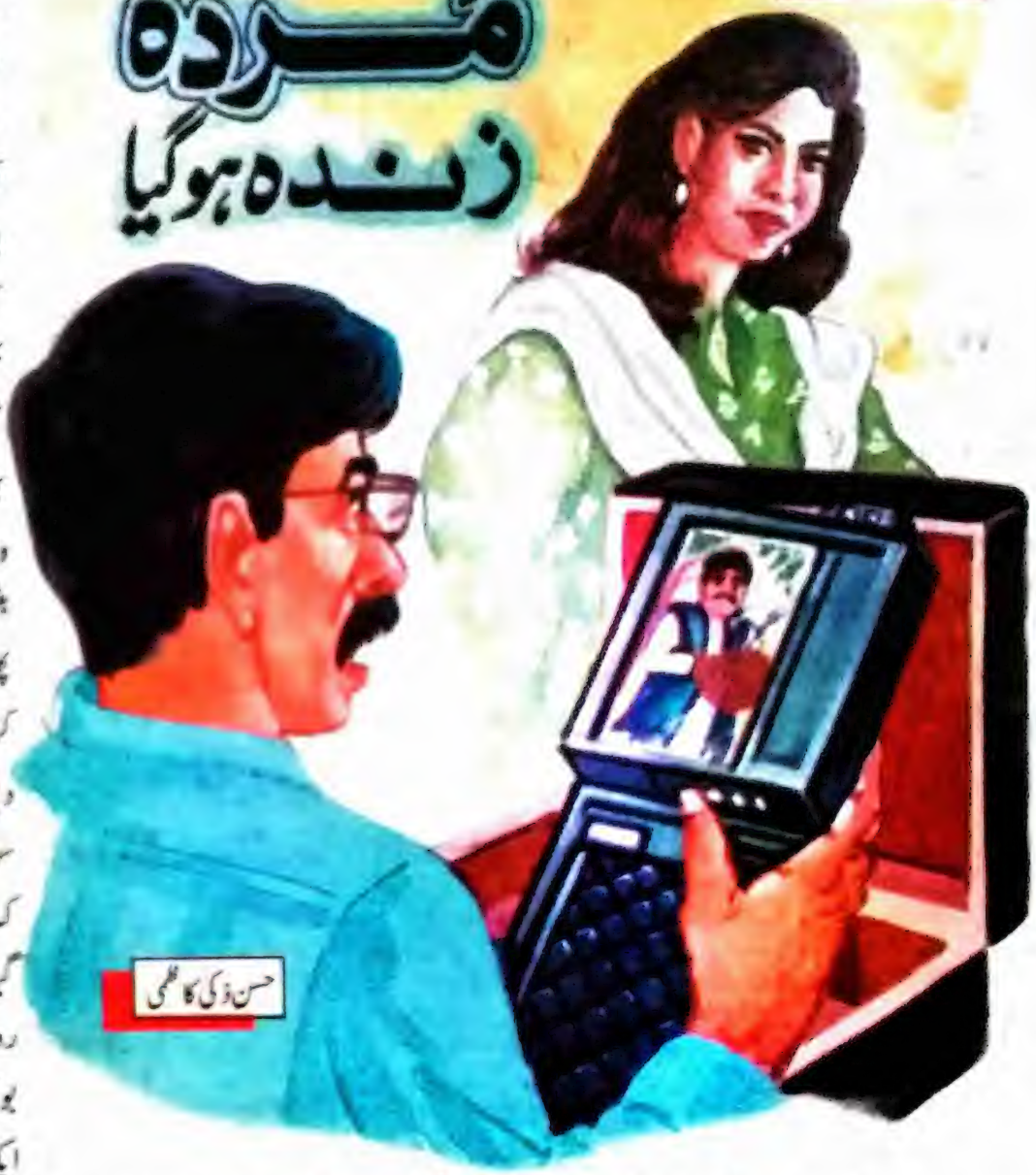

حسن ذکی کاظمی

میز پر رکھے وڈیو موبائل فون کی سرخ روشنی اور گھنٹی سے پرویز چونک پڑا۔ اس نے موبائل فون ہاتھ میں لے کر بٹن دبایا تو آواز آئی: "ایک اجنبی دروازہ تک آیا اور باہر رکھا ہوا پیکٹ اٹھا کر واپس چلا گیا"۔

پرویز نے دوسرا بٹن دبا کر کہا۔ "شکریہ کمپیوٹر' آپ نے جو وڈیو بنائی ہے پلیز وہ مجھے دکھا دیجئے"۔

چند سکنڈ گزرے تھے کہ پانچ بار ٹک ٹک کی آواز آئی اور موبائل فون کے درمیان میں لگے ہوئے چھوٹے سے اسکرین پر وڈیو چلنا شروع ہوئی۔ وڈیو ابھی چلی ہی تھی کہ پرویز چیخ پڑا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ناممکن بالکل ناممکن"۔

پرویز ابھی حیرت سے بولے ہی جا رہا تھا کہ فلم ختم ہو گئی۔

پرویز نے موبائل فون کا بٹن پھر دبایا اور بولا۔ "کمپیوٹر امہربانی کر کے یہ فلم مجھے دوبارہ دکھادیں"۔

ٹک ٹک کی آواز آئی اور چند سکنڈ بعد وڈیو پھر شروع ہو گئی۔ پرویز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسکرین کو تکتا رہا اور کہتا رہا۔ "یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے"۔

وڈیو دیکھنے کے بعد پرویز نے بٹن دبا کر موبائل بند کر دیا اور پھر سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ وہ پچھلے دنوں کی باتیں سوچتا رہا' سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اس پر کچھ خوف طاری ہو گیا۔ پھر وہ جلدی سے اٹھا اور روم فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگا لی۔ ایک سانس میں وہ آدھی بوتل پی گیا اور پھر صوفے پر لیٹ گیا۔ طبیعت ذرا ٹھیک ہوئی تو اس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اٹھا اور سکریٹری کے کمرے میں جھانک کر بولا "کام میں دل نہیں لگ رہا۔ میں گھر جا رہا ہوں"۔

اب وہ بریف کیس اٹھا کر باہر جانے ہی والا تھا کہ اسے خیال آیا کہ اس کی بیوی شہلا تو ابھی اپنے دفتر سے واپس نہیں آئی ہو گی اور نہ ہی اس کا بیٹا نوید اور بیٹی صائمہ کالج سے آئے ہوں گے۔ یہ سوچتے ہی وہ خوف جو اس پر تھوڑی دیر پہلے طاری ہوا تھا پھر لوٹ آیا اور اس نے جلدی گھر جانے کا فیصلہ بدل دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنی خود غرضی پر افسوس بھی ہوا اور شرمندگی بھی۔ اس نے سوچا کہ وہ کس قدر خود غرض ہے کہ خود تو خطرہ سے دور رہنا چاہتا ہے اور بیوی بچوں کی کوئی پروا نہیں۔ اگر وہ اکیلے گھر پہنچے تو ان کے لیے بھی

تو وہاں خطرہ ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی پرویز کار پارکنگ کی طرف چل پڑا۔ اس نے سوچا کہ وہ گھر کے سامنے سڑک پر گاڑی کھڑی کر کے بیوی بچوں کا انتظار کرے گا اور پھر وہ سب ساتھ ساتھ گھر میں جائیں گے۔

تقریباً پونا گھنٹا انتظار کرنے کے بعد اسے سامنے سے بیوی کی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ جیسے ہی گاڑی قریب سے گزری پرویز نے ہاتھ ہلایا۔ شہلا نے تھوڑا آگے جا کر گاڑی کھڑی کی اور گاڑی سے اتر کر پرویز کے پاس آتے ہوئے بولی۔ "خیریت تو ہے آج جلدی آگئے؟ اور یہاں کیوں کھڑے ہو؟ چابی گم ہو گئی یا کیا کسی کا انتظار کر رہے ہو؟"

پرویز سوالوں کی اس بوچھاڑ سے چڑ گیا اور کہنے لگا۔

"تمہارے سوا کس کا انتظار کر سکتا ہوں بھلا؟ وفادار شوہر جو ٹھہرا"۔

گاڑیاں پارک کر کے دونوں گھر کے اندر آئے تو شہلا نے پوچھا۔ "اچھا اب بتاؤ خیریت تو ہے؟ جلدی کیوں آگئے اور باہر کیوں.....؟"

پرویز نے شہلا کی بات کو تو سنی ان سنی کر دیا اور خود سوال کیا۔ "یہ بتاؤ کوئی ٹیلی فون تو نہیں آیا؟ یا کوئی آیا تو نہیں؟"

"بہت سارے ٹیلی فون آئے۔ بہت سے لوگ آئے۔ آخر دفتر ہے۔ تم نے سوال ہی عجیب کیا ہے" شہلا نے جواب دیا۔

پرویز پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا اب اور بھی بوکھلا گیا۔ پاس بیٹھتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا۔ "ہاں سوال تو واقعی عجب ہے لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے۔ میرا مطلب ہے آج کل میں گھر پر تو کوئی فون نہیں آیا یا کوئی ملنے تو نہیں آیا؟"

شہلا نے سنجیدگی سے کہا۔ "پرویز! اگر گھر پر کوئی ملنے آتا یا کسی کا فون آتا تو میں اس کے بارے میں تمہیں ضرور بتاتی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں کس کا انتظار ہے؟"

پرویز کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ "کسی کا نہیں، بس یوں ہی پوچھ یا تم سے، اچھا ایک پیالی چائے پلا دو"

شہلا چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف بڑھی تو پرویز چیخ پڑا "ٹھہرو، ٹھہرو، میں ساتھ چلتا ہوں"۔

شہلا رک گئی۔ اس نے غور سے پرویز کو دیکھا اور کہنے لگی "پرویز! تم آج مجھے بہت خوف زدہ لگ رہے ہو"۔

پرویز نے آہستہ سے جواب دیا۔ "بات ہی کچھ ایسی ہے۔ دراصل وہ جو ہمارا "ہوم سیکیورٹی سسٹم" ہے نا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے اس کے بارے میں؟"

شہلا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ تو معلوم ہے کہ ایک جاپانی کمپنی نے جو برقی آلات بناتی ہے 1999ء میں گھروں اور دیگر جگہوں کی حفاظت کا ایک نظام تیار کیا تھا جس پر تجربے ہوتے رہے اور اب پانچ چھ سال بعد یہ نظام گھروں اور دفتروں وغیرہ میں لگایا جا رہا ہے اور ہم بھی ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں جن کے گھر میں یہ سسٹم لگایا گیا ہے"۔

پرویز نے بات کاٹی اور بولا۔ "یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ ہم خوش قسمت ہیں یا بد قسمت، فی الحال تو میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں"۔

شہلا بھی پریشان ہو گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔

"اللہ رحم کرے، تم تو کافی خوف زدہ لگ رہے ہو"۔

پرویز نے بھی بڑے دھیمے سے جواب دیا۔ "بات ہی کچھ ایسی ہے۔ اچھا تو تمہیں ہوم سیکیورٹی سسٹم کے بارے میں اور کیا معلوم ہے؟"

شہلا نے جلدی سے کہا۔ "بس اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ نظام ہمارے گھر میں لگا دیا گیا ہے۔ تم نے کچھ بتایا ہی نہیں اور اب بھی بس یہی کہے جا رہے ہو کہ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ اللہ کے بندے کھل کر بات کرو۔ مجھ سے کیوں ڈر رہے ہو؟"

پرویز نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں تم سے کیوں ڈرنے لگا۔ میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ بھلا ڈرنے کی کیا بات ہے؟ کس کا ڈر؟ کیا ڈر، واہ خوب کہا"۔

شہلا نے پرویز کو تنگ کرنے کو کہا۔ "تو پھر ڈر کی گردان کیوں کر رہے ہو؟ اچھا اب میں چائے لاتی ہوں۔ پھر تم اطمینان سے مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟"

چند منٹ میں شہلا چائے لے آئی۔ پرویز نے جلدی جلدی دو تین گھونٹ لیے اور پھر کہنے لگا۔ "ہوم سیکیورٹی سسٹم

کے تحت ہمارے گھر کے دروازے پر اور ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی برقی آنکھیں لگائی گئی ہیں۔ برقی آنکھ نام کے یہ آلے دروازے اور گھر کے آس پاس آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ خواہ وہ پالتو جانور ہوں' ڈاکیا ہو' اسٹور سے سامان لانے والا لڑکا ہو' کوئی اور شخص ہو یا چور ڈاکو ہو۔ اگر یہ برقی آنکھ محسوس کرتی ہے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے تو یہ فوراً گھر کے مالک کو اپنے کمپیوٹر کے ذریعے اس کے خاص وڈیو موبائل فون پر خطرے کی اطلاع دیتی ہے۔ ساتھ ہی یہ برقی آنکھ اس واقعہ کی فلم بھی بنالیتی ہے جسے وہ مالک کے کہنے پر وڈیو موبائل فون کے ننھے سے اسکرین پر دکھا سکتی ہے"۔

شہلا نے کہا۔ "بہت دل چسپ نظام ہے یہ تو۔ اچھا اپنا یہ موبائل فون تو دکھاؤ' ہوں..... ہوں..... اچھا یہ ہے اس کا اسکرین..... یہ بیچ میں گول گول سا۔ لو اتنی اہم بات تم نے آج تک بتائی ہی نہیں۔ آج پریشانی میں مبتلا ہوئے تو بتا رہے ہو"۔

پرویز نے موبائل فون واپس لیتے ہوئے کہا۔

"دراصل وہ..... بات ہی کچھ ایسی ہے"۔

شہلا نے چڑ کر کہا۔ "اللہ کا واسطہ اب بات ہی کچھ ایسی ہے' کا پیچھا چھوڑ دو۔ بات ایسی ہے یا جیسی ہے یا کیسی ہے ایک بار ہمت کر کے بتا ڈالو۔ مجھے بتا دو گے تو تمہارا خوف ختم ہو جائے گا"۔

پرویز کو غصہ آگیا۔ "خواہ مخواہ خوف کا طعنہ دے رہی ہو۔ میں کیا ڈرپوک نظر آتا ہوں تمہیں؟ خوف' ڈر ہونہہ..... بلاوجہ الزام لگاتی ہو"۔

شہلا نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا تو بن جاؤ شیر اور ایک ہی سانس میں سارا ماجرا بیان کر ڈالو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"

میاں بیوی میں ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شہلا نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا اور ہیلو کہا۔ چند سکنڈ بعد اس نے پرویز سے کہا۔ "کوئی ایس اے بخاری صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیلی فورنیا سے آئے ہیں"۔

پرویز چونک پڑا "کیلی فورنیا سے آئے ہیں" یہ کہہ کر وہ جھپٹا اور ریسیور شہلا کے ہاتھ سے چھین کر فون بند کر دیا۔ چند لمحے بعد اس نے ٹیلی فون کا پلگ نکال دیا اور خاموش بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف طاری تھا۔ شہلا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"آپ عجیب آدمی ہیں۔ کوئی شخص امریکا سے آیا ہے' آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اور آپ نے فون بند کر دیا اور پھر پلگ ہی نکال دیا۔ وہ بے چارا فون کئے جا رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم یہاں فون ڈیڈ ہو گیا ہے۔ اس کے پاس موبائل کا نمبر بھی پتا نہیں ہو گا یا نہیں"۔

پرویز نے شہلا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "بات ہی کچھ ایسی ہے" شہلا کو غصہ آگیا۔ "وہی مرغے کی ایک ٹانگ' کچھ اور بھی کہیں گے؟ کچھ بتائیں گے بھی؟ پسینے میں ڈوب گئے ہیں۔ ڈر کے مارے حالت خراب ہے۔ ہوا کیا؟"

پرویز پہلے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں۔ ذرا سوچنے دو۔ ایس اے بخاری..... سلیم احمد بخاری۔ سلیم احمد بخاری چیف اکاؤنٹنٹ کیلی فورنیا۔ ہوں ہوں" پرویز خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچ کر اس نے پھر بولنا شروع کیا اور ساتھ ہی وڈیو موبائل فون کا ایک بٹن دبایا۔

"کمپیوٹر! پلیز تین بج کر پچیس منٹ پر جو فلم بنی تھی 00X3۔ اسے اب اپنے اسکرین پر دکھا دیں"۔

چند سکنڈ ٹک ٹک کی آواز آئی اور کمپیوٹر کے اسکرین پر وڈیو شروع ہوئی۔ جب اجنبی دروازے کے قریب آکر وہ پیکٹ اٹھانے لگا تو پرویز نے شہلا سے پوچھا۔

"تم نے اس شخص کو کبھی دیکھا ہے؟ اسے پہچانتی ہو؟"

شہلا نے اپنے بال درست کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ یاد تو آرہا ہے کہ انہیں دیکھا ہے۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ کہاں' اچھا ٹھہرو ذرا سوچنے دو..... ہاں ہاں ہاں..... ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ ہاں یاد آیا..... یہ صاحب جب ملازمت چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس امریکا جا رہے تھے تو دفتر میں ان کی رخصتی دعوت ہوئی تھی۔ اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ نام بھی یاد آگیا سلیم احمد بخاری..... لیکن غالباً آپ نے بتایا تھا....."۔

پرویز نے بات کاٹی۔ "تم نے ٹھیک پہچانا اور تمہیں ٹھیک یاد ہے اور یہ فون بھی ان ہی کا تھا"۔

شہلا نے حیرت سے کہا۔ "لیکن پرویز' انہوں نے تو اپنا نام ایس اے بخاری بتایا تھا"

پرویز گردن ہلاتے ہوئے بولا "ہاں ایس اے بخاری..... یعنی سلیم احمد بخاری"۔

شہلا اور زیادہ حیران ہوئی۔ اس نے پوچھا "اور یہ وڈیو بھی آج کی ہے؟ اور وہ ہمارے دروازے کے باہر رکھا ہوا پیکٹ بھی اٹھا کر لے گئے"۔

اب خوف زدہ ہونے کی باری شہلا کی تھی۔ اس کا تو رنگ ہی پیلا پڑ گیا۔ پسینا آنے لگا۔ ہمت کر کے اس نے پرویز سے پوچھا۔ "تمہاری اطلاع صحیح تھی"۔

پرویز نے پورے یقین سے کہا "ہاں ہاں سارے دفتر کو معلوم ہے۔ سلیم احمد کے بیٹے فہیم کا پیغام آیا تھا۔ وہ ہمارے نوید کے ساتھ یہاں کالج میں پڑھتا تھا۔ دونوں کا خاصا ملنا جلنا تھا"۔

شہلا تقریباً چیخ پڑی۔ "تو یہ سب کیا ہے؟ ایک شخص جو تین سال پہلے مر چکا ہے کس طرح آج وڈیو میں نظر آسکتا ہے؟ اور وہ فون کس طرح کر سکتا ہے؟ اچھا وہ وڈیو ایک بار پھر دکھایئے"۔

ابھی پرویز نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی اور پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ پرویز اور شہلا بجلی کی طرح تیزی سے لاؤنج سے اٹھ کر سونے کے کمرے میں گھس گئے اور تالا لگا لیا۔ باہر کسی کے چلنے پھرنے اور چیزیں ادھر ادھر رکھنے کی آواز آئی۔ دونوں میاں بیوی دم سادھے رہے۔ اتنے میں کسی نے فون پر نمبر ملایا اور بولا "السلام علیکم بخاری صاحب! میں نوید بول رہا ہوں۔ وہ پیکٹ آپ کو مل گیا؟ ارے نہیں، شکریہ کی کیا بات ہے۔ اس میں فہیم کے سرٹی فکٹ ہیں اور کالج کے دوستوں کی چند تصویریں اور ایک خط میں نے اس کے نام لکھ کر اسی پیکٹ میں رکھ دیا ہے۔ اچھا آپ ابو سے ضرور مل کر جایئے گا ورنہ انہیں شکایت ہو گی..... اچھا یہ کیسے ہوا؟ امی نے فون اٹھایا اور بند کر دیا؟ پھر ڈیڈ ہو گیا؟ تعجب ہے"۔

نوید کی ٹیلی فون پر بات ہو ہی رہی تھی کہ پرویز اور شہلا کمرے سے باہر نکل آئے۔ پرویز نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتا لہٰذا نوید نے ایک دو باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ فون بند کر کے وہ باپ سے کہنے لگا۔ "ابو! کیا آپ بخاری صاحب سے بات نہیں کرنا چاہتے؟"

پرویز نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "بات ضرور کروں گا لیکن پہلے یہ کھوج لگالوں کہ مردہ زندہ کیسے ہو گیا؟"

نوید نے حیرت سے کہا۔ "کیسا مردہ؟ کون زندہ ہو گیا؟"

پرویز کا خوف جوان بیٹے کے گھر آجانے سے دور ہو چکا تھا لہٰذا اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نہایت سکون سے کہا۔ "ارے یہی سلیم احمد بخاری جن سے تم بات کر رہے تھے"

نوید ہنس پڑا اور بولا۔ "ابو یہ سلیم احمد تو نہیں تھے۔ یہ تو ایس اے بخاری تھے"۔

"ایس اے بخاری کہ لو یا سلیم احمد بخاری ایک ہی بات ہے"

نوید نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "نہیں ابو یہ سلیم احمد بخاری نہیں۔ شمیم احمد بخاری ہیں۔ سلیم صاحب کے جڑواں بھائی۔ فہیم کے چچا سلیم صاحب کے انتقال کے بعد فہیم اور اس کی امی شمیم صاحب کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ شمیم صاحب اپنے کسی کام کے سلسلہ میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ فہیم نے اپنے کچھ کاغذات اور تصویریں منگوائی تھیں۔ میں نے پیکٹ بنا کر اسے کالج جاتے ہوئے دروازے کے باہر رکھ دیا۔ کیوں کہ آپ اور امی دفتر میں تھے اور صائمہ بھی کالج جا رہی تھی۔ یوں شمیم صاحب آکر پیکٹ لے گئے"۔

پرویز بڑے غور سے بیٹے کی بات سن رہا تھا۔ اس نے بس اتنا کہا "اچھا تو یہ صاحب سلیم بخاری کے جڑواں بھائی ہیں؟"

نوید نے سر ہلایا اور بولا۔ "جی ہاں! اور دونوں کی شکلیں بھی بے حد ملتی جلتی ہیں۔ جس دن وہ آئے تھے اسی دن فہیم کا فون آیا تھا۔ تو میں ان سے ملنے ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ وہ باہر آئے تو ایسا لگا جیسے فہیم کے ابو سامنے سے آرہے ہیں۔ پہلے تو میں ڈر ہی گیا۔ پھر یاد آیا کہ فہیم نے بتایا تھا کہ دونوں جڑواں بھائیوں کی شکل بہت ملتی جلتی ہے"۔

پرویز نے آہستہ سے کہا "مجھے بھی سلیم نے بتایا تھا لیکن میں بھول چکا تھا۔ اب یاد آیا۔ خواہ مخواہ کی پریشانی مول لی"

شہلا نے ہنستے ہوئے زور سے کہا "پریشانی نہیں، خوف کہیے خوف"۔

پرویز نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں، لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے"

دونوں ہنسے اور نوید انہیں حیران ہو کر دیکھتا رہا۔

آپ بھی لکھیے

ریشم کی تھیلی

کاشف ضیا عرشی' ملتان

قاضی ابو بکر محمد بن عبدالباقی ایک مشہور عالم دین گزرے ہیں۔ آپ کی ولادت بغداد میں ہوئی اس لیے آپ کو شیخ بغدادی بھی کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں جب کسی کو علم حاصل کرنا ہوتا تھا تو وہ دور دراز کے سفر کر کے مختلف شہروں کے علماء سے علم حاصل کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک مرتبہ حضرت شیخ بغدادی علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے اور مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ میں آکر ٹھہر گئے۔ مکہ میں آپ کا سارا دن مختلف علماء سے قرآن و حدیث کے درس سننے میں گزرتا تھا۔ آپ گھر سے جو زادراہ ساتھ لائے تھے وہ سارے کا سارا خرچ ہو چکا تھا۔ اب کھانے پینے کو بھی پیسے نہ رہے تھے۔

ایک دن شام کے وقت آپ گھر سے ٹہلنے کے لیے نکلے۔ ابھی گلی کے موڑ پر ہی پہنچے تھے کہ سامنے ایک ریشم کی تھیلی پڑی ہوئی ملی۔ آپ وہ تھیلی اٹھا کر گھر لے آئے۔ گھر لا کر جب اسے کھولا تو اس میں سے موتیوں کا سفید رنگ کا قیمتی ہار نکلا۔ شیخ صاحب نے ایسا قیمتی ہار اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد باہر گلی میں شور بلند ہوا۔ شیخ بغدادی باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک بوڑھا اونچی آواز میں اعلان کرتا پھر رہا ہے کہ میری ایک ریشم کی تھیلی گم ہوئی ہے' اس کے اندر موتیوں کا ایک ہار ہے۔ جو شخص وہ تھیلی واپس کرے گا میں اسے پانچ سو دینار انعام دوں گا یہ کہ کر اس بوڑھے نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا جس میں پانچ سو دینار تھے۔

شیخ بغدادی جلدی سے آگے بڑھے اور اس کے قریب پہنچ کر کہا "باباجی ذرا میری بات سنیئے' وہ تھیلی میرے پاس ہے"۔

بوڑھا آدمی یہ سن کر یک دم ٹھٹک گیا۔ شیخ صاحب اس بوڑھے کو اپنے گھر لے آئے اور اس سے تھیلی کے بارے میں نشانیاں پوچھیں۔ بوڑھے نے سب نشانیاں ٹھیک بتا دیں۔ شیخ نے فوراً تھیلی نکال کر بوڑھے کے سامنے رکھ دی اور بوڑھے نے 500 دینار شیخ کے آگے کر دیئے۔

پانچ سو دینار کی بڑی رقم دیکھ کر شیخ کی حالت بدل گئی۔ کیوں کہ اس زمانے میں انہیں کھانے پینے کے لیے پیسوں کی بھی ضرورت تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے بوڑھے سے کہا "نہیں نہیں باباجی یہ تو میرا فرض تھا کہ میں آپ کی چیز آپ کو واپس کروں"۔

بوڑھا بالکل نہ مانا۔ آخر پانچ سو دینار چھوڑ کر چلا گیا۔

شیخ بغدادی اس کے چند دن بعد تک تو مکہ مکرمہ میں ہی رہے اور اس کے بعد اندلس کی طرف بحری سفر شروع کر دیا۔ اتفاق سے سمندر میں طوفان آگیا اور کشتی راستے میں ہی ٹوٹ گئی۔ سب مسافر ڈوب گئے اور ان کا سامان ضائع ہو گیا۔ شیخ بغدادی تنہا ایک تختے پر کئی دن تک سمندر میں تیرتے رہے۔ آخر کار خدا خدا کر کے ایک جزیرے پر پہنچے جہاں کچھ لوگ جھونپڑیوں میں آباد تھے۔ شیخ صاحب کو کچھ نہ معلوم تھا کہ یہ کون سا جزیرہ ہے اور یہاں کون لوگ آباد ہیں۔ وہ آخر کار ایک مسجد میں بیٹھ گئے اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔

جزیرے کے لوگوں نے انہیں قرآن پاک پڑھتے دیکھا تو اپنے سردار کے ساتھ ایک وفد بنا کر ان کے پاس آئے اور کہا "آپ ہمیں قرآن پاک پڑھا دیں ہم آپ کو اس کا معاوضہ دیں گے"۔ شیخ صاحب نے ان کی یہ بات منظور کر لی اور بستی کے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے لگے۔ اس کے صلے میں ان لوگوں نے شیخ صاحب کو ڈھیروں مال دیا۔

پھر کچھ دن بعد جزیرے کے لڑکے شیخ صاحب سے خوش نویسی بھی سیکھنے لگے۔ جس کی وجہ سے انہیں وہاں سے مزید مال و دولت حاصل ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد جزیرے کے لوگ شیخ بغدادی کے پاس پھر آئے اور کہا "یہاں ایک دولت مند یتیم لڑکی ہے آپ اس سے شادی کرلیں تاکہ آپ کی گزر بسر صحیح ہو سکے"۔

شیخ بغدادی نے بہت منع کیا لیکن وہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے اور آخر کار شیخ صاحب کی اس یتیم لڑکی سے شادی ہو گئی۔ شادی کے دن شیخ صاحب نے دیکھا کہ اس لڑکی کے گلے میں وہی سفید رنگ کے موتیوں کا ہار ہے جو انہیں مکہ میں ریشم کی تھیلی میں ملا تھا۔

شیخ صاحب نے لوگوں سے اس ہار کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس کا ہے۔ لوگوں نے شیخ صاحب سے پوچھا کہ آپ اس ہار کو کیسے پہچانتے ہیں۔ جواب کے طور پر انہوں نے ہار کے ملنے اور بوڑھے کو واپس کرنے کا سارا واقعہ سنا دیا۔

یہ سن کر لوگوں نے خوشی سے نعرے مارے اور شیخ صاحب کو کندھوں پر اٹھالیا اور کہا کہ وہ بوڑھا اس لڑکی کا باپ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھے دنیا میں صرف ایک ہی سچا اور پکا مسلمان ملا تھا کاش وہ مجھے دوبارہ مل جائے تو میں اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دوں"۔

بستی کے لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ مرتے وقت وہ بوڑھا نصیحت کر کے مرا تھا کہ اگر ہو سکے تو میری بیٹی کا نکاح اسی ایمان دار نوجوان سے کرنا اور وہ آپ ہی ہیں۔ اس کے بعد شیخ بغدادی مدت تک اس بستی میں درس دیتے رہے (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ہینڈ گرنیڈ

فائزہ شمبلیلہ بلوچ ڈیرہ اسماعیل خان

ہمارے بڑے بھیا کے ایک دوست ہیں' دوست کیا بلکہ یار غار ہیں۔ والدین نے ان کی پیدائش پر بڑی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے ان کے لیے شیر زمان نام تجویز کیا لیکن گاؤں کے لوگوں کو ان کا یہ نام کچھ پسند نہیں آیا اور وہ انہیں بڑی دیدہ دلیری سے "شیر اجن" کہنے لگے۔

آٹھویں کلاس میں مسلسل آٹھ بار فیل ہونے کے بعد جب وہ بیس برس کے ہو گئے تو ایک دن اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے انہیں اپنے دفتر میں بلا کر کہا "شیر اجن! اب میں تمہیں مزید اس اسکول میں برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا آج سے تم اپنے آپ کو اسکول سے فارغ سمجھو"۔

یوں شیر اجن کا تعلیمی مستقبل تباہ ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اگر ذرا دور اندیشی کا ثبوت دیتے تو بقول شیر اجن کے آج وہ کم از کم ہاف ایم اے ہوتا۔

بھیا کہتے ہیں کہ شیر اجن مجھے اس لیے پسند ہے کہ وہ انسانی حماقتوں کا ایک عظیم اور ضخیم مجموعہ ہے اور احمق لوگ میری کم زوری ہیں۔ ویسے بھی شیر اجن ایک بے ضرر قسم کا احمق ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ شیر اجن بڑے ٹھاٹ باٹ سے تیار ہو کر بھیا کے پاس پہنچا اور بلا تمہید بولا۔ "یار کوئی کام ہے تو بتاؤ آج میں شہر جا رہا ہوں"۔

بھیا نے جواباً کہا "ہاں کام تو ہے اگر تم کر سکو تو؟"

"تم کام بتاؤ یار' مجھے دیر ہو رہی ہے" شیر اجن نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

بھیا بولے "ایسا کرنا کہ شہر سے فائزہ کے لیے چھٹی جماعت کی "سیکنڈ ہینڈ" کتابیں لیتے آنا"۔

شیر اجن حیران ہو کر بولا "سیکنڈ ہینڈ" یہ کس بلا کا نام ہے"

بھیا نے ہنستے ہوئے جواب دیا "سیکنڈ ہینڈ کتابیں' پرانی کتابوں کو کہتے ہیں اور یہ کتابیں آدھی قیمت پر ملتی ہیں"۔

اب شیر اجن خراماں خراماں شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

شومئی قسمت' شہر پہنچ کر اسے "سیکنڈ ہینڈ" کا لفظ بھول گیا۔ کتابوں کی دکان پر پہنچ کر وہ چند لمحے تو دکان دار کو عجیب و غریب نظروں سے گھورتا رہا اور پھر جب دکان دار اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ گڑبڑا کر بولا "بھ..... بھائی..... مجھے ہینڈ گرنیڈ خریدنا تھا"۔

دکان دار نے پہلے تو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر نرم پڑتے ہوئے بولا "دیکھو بھائی! مذاق مت کرو' میں ایک

شریف آدمی ہوں"۔

شیر اجن نے کہا "میں مذاق تو نہیں کر رہا' مجھے واقعی ہینڈ گرنیڈ چاہئیں"۔

دکان دار نے جب اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی دیکھی تو ایک دم غصے سے بولا "تم جاتے ہو یا میں پولیس کو فون کروں"۔

دکان دار کی بات سن کر شیر اجن بوکھلا کر بولا "کیوں بھائی میں کوئی تم سے بم مانگ رہا ہوں جو تم پولیس کو فون کرنے کی بات کر رہے ہو؟"

اب تو دکان دار کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے سوچا' ہو نہ ہو یہ شخص ضرور کسی خفیہ محکمے سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم وہ ڈرتے ڈرتے بولا "میرے بھائی! آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ میں ایک شریف انسان ہوں' میں صرف کتابیں بیچتا ہوں' آپ بے شک میری دکان کی تلاشی لے سکتے ہیں"۔

شیر اجن نے کہا "میں بھی تو کتابیں خریدنے آیا ہوں نا' ہینڈ گرنیڈ کتابیں چھٹی جماعت کے لیے"۔

ہینڈ گرنیڈ کتابوں کا سن کر دکان دار فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا اور اس کی اڑی اڑی سی رنگت آہستہ آہستہ معمول پر آگئی اور وہ ہنس کر بولا "باپ رے! تم نے تو میری جان نکال دی تھی۔ جانتے ہو ہینڈ گرنیڈ کیسے کہتے ہیں؟"

شیر اجن نے فوراً جواب دیا "پرانی کتابوں کو کہتے ہیں"

"پرانی کتابوں کو سیکنڈ ہینڈ کتابیں کہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر دکان دار نے جلدی جلدی چھٹی جماعت کا سیکنڈ ہینڈ کورس نکال کر شیر اجن کے حوالے کیا اور اس سے بل وصول کرنے کے بعد دوبارہ بولا "سنو میرے بھائی' ہینڈ گرنیڈ دستی بم کو کہتے ہیں اور تمہاری بڑی مہربانی ہو گی آج کے بعد میری دکان پر تشریف نہ لائیے گا ورنہ کسی دن مجھے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا"۔

"کیا ہو جائے گا؟" شیر اجن نے دوبارہ دکان دار سے پوچھنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں میرے بھائی' جاؤ دیر ہو جائے گی" یہ کہہ کر دکان دار نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور شیر اجن اسے اس کے حال پر چھوڑ کر دکان سے باہر نکل آیا (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

گل آفند

شفقت سلطانہ' لاہور

دو روز سے ہمارے اسکول میں ایک نیلی آنکھوں والا سرخ و سفید رنگت اور مضبوط جسم کا لڑکا آرہا تھا۔ ہم سب دوستوں کو خواہ مخواہ تجسس ہو رہا تھا کہ وہ کس کلاس میں داخلہ لے رہا ہے۔

"شکل سے ہنس مکھ لگتا ہے" ہمارے ایک دوست نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں فلسفہ بگھارا۔

"کھیلوں میں بھی ماہر دکھائی دیتا ہے"۔ دوسرے کھلاڑی دوست نے اپنے انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

"دوستو! ذرا یہ تو سوچو کہ وہ کس کلاس میں داخلہ لے رہا ہے۔ اگر اس نے ہماری کلاس میں داخلہ نہ لیا تو بے کار ہوئیں ہماری سب سوچیں اور ہمارے اندازے!"

میری اس بات پر سب دوستوں نے اتفاق رائے کیا اور ایک جاسوس طبع کا لڑکا جسے سب لڑکے کھوجی کہہ کر پکارتے تھے اس بات کا کھوج لگانے چل پڑا کہ نئے آنے والے صاحب کس جماعت میں داخلے کے لیے آئے ہیں۔

تھوڑی دیر اسٹاف روم کے باہر کھڑے رہنے کے بعد کھوجی نے آکر بتایا کہ وہ ہماری ہی کلاس میں داخلہ لے رہا ہے۔ میں نے پوچھا "نام کیا ہے اس کا؟" کھوجی نے ذرا جھجکتے ہوئے بتایا "گل آفند!"

"کیا کہا گل آفند؟"

اب تو سبھی اس نام کا ورد کرنے لگے۔ گل آفند' گل آفند!!

"بھئی اس نام کا لڑکا تو پورے اسکول میں نہیں ہے" ہر کلاس میں تین تین مرتبہ فیل ہونے والے ایک نالائق لڑکے "فل اسٹاپ" نے بتایا۔

"ہاں بھئی پورے اسکول کی ہسٹری تو تمہی کو یاد ہو سکتی ہے"۔ بار بار فیل ہونے کی وجہ سے نبیل کو لڑکے فل اسٹاپ کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اکرم جو خود بھی شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس

کے والد صاحب بھی اچھے ذوق کے شاعر ہیں' اسے گل آفند نام کچھ عجیب سا معلوم ہوا اور کہنے لگا "گل آفند تو پنساری کی دکان کی کوئی چیز لگتی ہے' جیسے گل قند ا"

اس پر سب لڑکوں نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اتنے میں استاد صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے تو سب لڑکے پڑھنے میں منہمک ہوگئے۔

دوسرے روز گل آفند بھی ہماری کلاس میں آگیا۔ ہم سب کو اس کے نام سے واقفیت ہو چکی تھی لیکن شریر ذہن کے لڑکوں نے اسے گل قند کہہ کر پکارا تو گل آفند نے نہایت مہذب اور شائستہ لہجے میں بتایا "دوستو! میرا نام گل آفند ہے اور میرا تعلق صوبہ سرحد سے ہے لیکن میرے والد صاحب کی ملازمت زیادہ عرصہ پنجاب میں رہی ہے اس لیے مجھے پشتو کے ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی بھی بہت اچھی طرح آتی ہے"۔

اس کی اچھی عادت اور ذہانت کے باعث میں نے اسے اپنا دوست بنالیا۔ اب اس کا ہمارے ہاں آنا جانا ہو گیا تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ہمارے ہاں میرے والد صاحب کے نیم حکیم قسم کے ملنے والے تشریف لائے ہوئے تھے۔ بلا فیس نادر نسخہ جات بتاتے رہتے تھے اور پر زور طریقے سے ان پر عمل درآمد بھی کروانا چاہتے تھے۔ مگر زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی بس ہوں ہاں کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ ایک روز جو میری شامت آئی' میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو ذرا ڈانٹ کر کہا کہ جاؤ گل قند کو لے کر جلدی سے میرے پاس آؤ۔ پھر کیا تھا؟ نیم حکیم انکل نے میری بات سن لی اور فوراً اٹھ کر میرے کمرے میں آئے اور نہایت پیار بھرے لہجے میں کہنے لگے "میاں صاحب زادے' کیا عارضہ لاحق ہوا؟ گل قند کیوں منگوائی جارہی ہے؟ یہ لو معجون مصفائے معدہ"

میں انکار کرتا رہا اور انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ نہ جانے کیا بدمزہ سی چیز مجھے کندھوں سے پکڑ کر کھلا ڈالی۔ بس پھر کیا تھا' میں تھا اور واش روم! قضائے حاجت کے لیے آنے جانے میں اتنی پریڈ ہوئی کہ ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ نیم حکیم صاحب نے حالات بگڑتے دیکھے تو چپکے سے کھسک لیے۔ فیملی ڈاکٹر کے بروقت علاج سے آفاقہ ہوا تو میں نے سچے دل سے توبہ کی کہ آئندہ گل آفند کو گل قند کہہ کر کبھی نہ بلاؤں گا (تیسر انعام: 80 روپے کی کتابیں)

بہترین کام

منان لطیف ستی' راول پنڈی

چھٹیوں کے بعد سب لڑکے بڑی خوشی سے تروتازہ اسکول جارہے تھے۔ ویسے تو سب لڑکے ہی خوش باش نظر آتے تھے مگر ہماری جماعت ہشتم الف کے لڑکے کچھ زیادہ پرجوش دکھائی دیتے تھے۔ اس کی اصل وجہ ہمارے کلاس انچارج کا وہ اعلان تھا جو انہوں نے چھٹیوں سے قبل کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ چھٹیوں کے بعد سب سے اچھا عمل کرنے والے ایک طالب علم کو ایک زبردست انعام دیا جائے گا۔

اسمبلی کے بعد سب طلبہ قطاروں میں بڑے منظم انداز میں اپنی اپنی کلاسوں میں جانے لگے۔ ہماری کلاس کے بھی سب لڑکے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ سب کے چہروں پر ایسی پر تجسس خوشی چھائی ہوئی تھی جیسی کہ رزلٹ والے دن ہوتی ہے۔ اتنے میں ہمارے کلاس انچارج سر عبداللہ کمرے میں مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کے سلام کا جواب اتنے زور سے دیا گیا کہ کمرا گونج اٹھا۔

"ماشاء اللہ! بھئی لگتا ہے ان چھٹیوں میں آپ نے خوب جان بنائی ہے"۔ سر نے سب لڑکوں پر سرسری نگاہ ڈال کر کہا۔ پھر دوسرے لمحے انہوں نے میز کی دراز کا قفل کھولا اور ایک چمکتا دمکتا سنہری کپ میز پر رکھا۔ پھر ایک کتاب نکالی جو کہ سبز رنگ کے خوب صورت سے کاغذ میں پیک تھی۔

"ہاں! تو پیارے بچو' یاد ہے ناں وہ بات" سر عبداللہ کی آواز گونجی۔

سب لڑکوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ "جی سر" کی پرجوش آواز نے ایک مرتبہ پھر سر کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ پھر سر نے کہا "تو پھر باری باری سب بچے اپنے کام کی تفصیل بتائیں تاکہ سب سے بہترین کام کرنے والے طالب علم کو یہ انعام دیا جاسکے"۔

سب سے پہلے امجد نے اپنے کام کے متعلق بتایا "سر' میرے پڑوس میں ایک لڑکا رہتا ہے' وہ یتیم ہے۔ میں نے چھٹیوں میں ملنے والا سارا

جیب خرچ چھٹیاں ختم ہونے سے ایک ہفتہ قبل اسے دے دیا"۔

"بہت خوب!!" سر نے امجد کو داد دی۔ اس کے بعد سیفی کی باری تھی۔ وہ یوں گویا ہوا "سر' میں باجماعت نماز پڑھنے کا عادی نہ تھا۔ ان چھٹیوں میں بہت کوشش سے میں نے خود کو اس بات کا عادی بنالیا کہ پانچوں نمازیں اب باجماعت پڑھتا ہوں"۔

"شاباش بیٹے! بے شک باجماعت نماز پڑھنے کے بہت فضائل ہیں" سر نے سیفی کی بات کو سراہتے ہوئے کہا۔

اب یہ سلسلہ چل نکلا۔ سب لڑکوں نے اپنے اپنے عمل کے متعلق بتادیا تو سر عبداللہ نے خوشی سے کہا "مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے بہت اچھے اچھے کام کیے۔ سب نے اپنے اپنے کام کی تفصیل بھی بتادی' صرف صبیح نے کچھ نہیں بتایا۔ صبیح بیٹا آپ بھی کچھ بتائیں"۔

صبیح نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا "سر مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی بھی اچھا عمل نہ کر سکا"

سر نے اسے کریدتے ہوئے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ تمہارا روزانہ کا معمول کیا تھا؟"

صبیح نے بدستور سر جھکائے ہوئے کہا۔ "صبح اٹھ کر میں سب سے پہلے نماز پڑھنے مسجد جاتا تھا۔ پھر گھر آکر کچھ تلاوت کرتا تھا اور سیر کے لیے گھر سے نکلتا تھا۔ جب سورج نکل آتا تو واپس گھر آکر ناشتا کرتا تھا۔ اس کے بعد اگر گھر کا کوئی کام ہوتا تو وہ کرتا ورنہ کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔ جب گرمی بڑھ جاتی تو ہم کھیل ختم کر کے گھر لوٹ آتے۔ اس کے بعد میں ہوم ورک کرتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر سو جاتا۔ ظہر کی نماز پڑھتا اور نماز کے بعد گھر آکر اپنے پڑوس میں رہنے والے دو بچوں کو اسکول کا سبق پڑھاتا۔ وہ مجھ سے قرآن شریف بھی پڑھتے تھے۔ شام کو ابو کے ساتھ دکان پر چلا جاتا تھا۔ بس تقریباً میرا یہی معمول تھا"۔

"ارے واہ! انعام کا حق دار تو صبیح ہی ہے" سر عبداللہ نے اس کی بات ختم ہوتے ہی اچانک فیصلہ کر دیا۔ سب لڑکوں کے حیرت سے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ "پیارے بچو! آپ نے صبیح کے روزانہ کے معمول کی تفصیل سنی۔ اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ صبیح اپنے پڑوس میں رہنے والے دو بچوں کو قرآن مجید بھی پڑھاتا رہا ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور پھر دوسروں کو سکھائے" لہٰذا سب سے بہترین کام بے شک صبیح کا ہے اور وہی اس انعام کا اصل حق دار ہے" اور پھر سب لڑکوں کی زوردار تالیوں کی گونج میں صبیح کو سر عبداللہ نے انعام دے دیا (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

نجات

عائشہ احسان' لاہور

موسم پہلے سے کہیں زیادہ سرد ہو گیا تھا۔ تیز بارش کے ساتھ ساتھ ژالہ باری بھی ہو رہی تھی۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ ویسے بھی دیہات میں لوگ جلد سو جاتے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس چھوٹے سے مکان میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس لالٹین کی روشنی میں ایک کم عمر لڑکا لحاف لپیٹے اپنی کتاب پڑھ رہا تھا۔ صبح اس کا پرچہ تھا۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی چمک کی وجہ سے اسے پڑھنے میں مشکل تو ہو رہی تھی مگر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کا سوچتے ہوئے وہ پوری توجہ سے اپنی پڑھائی میں مصروف تھا۔

اس مکان میں دو کمرے اور ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس چھوٹے سے برآمدے کی چھت برسات کی متواتر ہونے والی بارشوں کو سہ سہ کر انتہائی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ دوسرا کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کمرے سے کبھی کبھی کم زور آواز میں "ہائے ہائے" کی تو کبھی کھانسی کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ یہاں ایک بیمار بوڑھا شخص سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے سرد ہوا کے جھونکوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ شاید اس کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ اس کا بوڑھا جسم ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا۔ سردی تو دوسرے کمرے میں بھی بہت تھی۔ وہ لڑکا پڑھتے پڑھتے جب کاغذ پر لکھنے کے لیے ہاتھوں کو لحاف سے باہر نکالتا تو اس کی انگلیاں سردی سے اکڑ جاتیں۔ لکھ لکھ کر اس کی انگلیاں سن ہو کر رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ کچھ دیر کو ہاتھ لحاف کے اندر لے جاتا اور پھر باہر نکال کر لکھنا شروع کر

دیتا۔

"بیٹے شہاب! یہاں سردی بہت ہے دیکھنا کہیں کھڑکی تو کھلی نہیں رہ گئی..... بیٹے سوگئے ہو گیا؟" دوسرے کمرے کی تاریکی سے ایک نحیف آواز ابھری۔

شہاب نے ٹھنڈ سے خوف کھاتے ہوئے آہستہ آہستہ پاؤں لحاف سے باہر نکالے۔ اسی دوران میں سرد ہوا کا جھونکا کھڑکی کے پردے کو اڑاتا ہوا آیا اور شہاب لحاف سے نہ نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ ان کی کھڑکی بند ہی ہوتی ہے۔ آج زیادہ سردی ہے نا اس لیے وہ سمجھ رہے ہیں کہ کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔ شہاب یہ سوچتے ہوئے لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دوسرے دن صبح اس کا پرچہ تھا۔ وہ پرچہ دینے کے لیے اسکول پہنچا۔ پرچہ سامنے آیا تو وہ بہت خوش ہوا کیوں کہ اسے سارے سوالات آتے تھے۔ وہ نظریں جھکا کر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ سوالات حل کرتا جا رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے نگاہ اٹھائی تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ امتحان کے کمرے میں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ حیرانی کے عالم میں قلم چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھاگ کر دروازے کی طرف بڑھا تاکہ دیکھ سکے کہ وہ سب لڑکے کہاں گئے جو اس کے ساتھ پرچہ دے رہے تھے اور استاد صاحب کہاں گئے جو ابھی ادھر موجود تھے۔ مگر یہ کیا؟ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں چیخیں ماریں۔ زور زور سے دروازہ پیٹا اور جتنی اونچی آواز میں چیخ سکتا تھا چیخا مگر کوئی بھی اس کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ آخر کار وہ تھک کر گر پڑا۔ گرتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی.....

بارش ابھی تک تھمی نہیں تھی مگر رات کافی بیت چکی تھی۔ پھر اسے آنکھ لگنے سے پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔ ابا ابھی بھی کھانس رہے تھے۔ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر کوئی ضرورت میں ہو اور دوسرے کو بلا رہا ہو اور کوئی اس کی آواز سن کر مدد کو نہ آئے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ لحاف ہٹاتے ہوئے اٹھا اور سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے ابا کے کمرے میں گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ ہوا سے کھل چکے تھے۔ ابا اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں تھے۔ شاید وہ خود اٹھ کر کھڑکی بند کرنا چاہتے تھے تاکہ سرد ہوا سے بچ سکیں۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور اسے مضبوطی سے بند کر کے کنڈی میں زنجیر پھنسا دی۔

"جیتے رہو بیٹا! خدا تمہیں کامیاب کرے" ابا کے ہونٹوں سے یہ دعا نکلی۔

"آمین" شہاب نے زیر لب کہا اور اپنے کمرے میں آکر لالٹین بجھا کے سکون سے سو گیا۔ دوسرے دن صبح اس کا پرچہ تھا اور وہ اطمینان سے امتحان کے کمرے میں پرچہ دے رہا تھا۔ شاید اس کے عمل نے اسے اس خوف سے نجات دلا دی تھی کہ وہ نظریں اٹھائے گا تو خود کو کمرے میں اکیلا پائے گا اور پھر اس کی آواز کوئی نہیں سنے گا خواہ وہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ بول لے (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

ہم نے کی توبہ!

محمد قاسم کلیار، بہاول پور

ہمیں کرکٹ کھیلنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب ہمیں کرکٹ سے نفرت ہے۔ اس کے پیچھے ایک واقعہ ہے جس سے متاثر ہو کر ہم نے کرکٹ کھیلنے سے توبہ کر لی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک دن ہم حسب معمول گلی میں ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ جس جگہ ہم کرکٹ کھیل رہے تھے اس سے کچھ دور کسی کرکٹ کلب کے کوچ کا گھر تھا۔ ایک گیند کو ہم نے ایسا شاٹ لگایا کہ وہ اڑتی ہوئی سیدھی اس کوچ کے گھر جا پڑی۔ ایک شخص اس گھر سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ہماری گیند تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا کہ گیند کس نے پھینکی ہے۔ ہمارے تو چھکے چھوٹ گئے کہ بچہ اب خیر نہیں ہے۔ ہم نے کانپتے ہوئے کہا "گیند کو ہم نے شاٹ لگایا تھا"۔

"ادھر آؤ" انہوں نے ہمیں کہا۔ چناں چہ ہم ان کے پیچھے چل پڑے۔ کچھ دور جا کر وہ رکے اور ہم سے بولے "بیٹا، تمہارا نام کیا ہے؟"

خیر محمد" ہم نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

بولے "کلب کرکٹ کھیلو گے؟"

تب ہماری جان میں جان آئی کہ اصل بات کیا ہے۔ ہم نے کہا" کھیلیں گے لیکن والد صاحب نہیں کھیلنے دیں گے"۔

انہوں نے کہا کہ تمہارے والد سے میں خود بات کر لوں گا۔ کل سے تم 8 بجے روزانہ جم خانہ کرکٹ کلب آجایا کرو۔ وہاں میں تجھے ٹریننگ دوں گا۔ مجھے تم مستقبل کے ایک اچھے بلے باز نظر آتے ہو۔ چناں چہ ہم نے حامی بھر لی اور اس دن کے بعد روزانہ جم خانہ کرکٹ کلب جانا شروع کر دیا۔ ایک ہفتے بعد ہمارے کلب کا کسی دوسرے کلب کی ٹیم کے ساتھ میچ تھا۔ جس میں ہم بھی شامل تھے۔ 10 بجے صبح میچ شروع ہوا۔ ہماری ٹیم کے کپتان نے ٹاس جیت کر پہلے بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے پہل تو ہمارے بلے باز مخالف ٹیم کے باؤلروں پر حاوی نظر آئے لیکن دس اوورں کے بعد جب مخالف ٹیم کے کپتان نے باؤلنگ میں تبدیلی کی اور ایک دراز قد حبشی قسم کے باؤلر کو بولنگ کے لیے لائے تو ہمارے بلے باز اس کے آگے جم کر نہ کھیل سکے اور جلد ہی تین ماہر کھلاڑی آؤٹ ہو گئے۔ اس کے بعد ہماری باری تھی چناں چہ ہم تیار ہو کر کریز پر پہنچ گئے۔ ہم تیار ہوئے اور باؤلر نے بھاگنا شروع کیا' ایمپائر کو کراس کیا اور پورے زور سے ہماری طرف گیند پھینکی۔ گیند اس کے ہاتھ سے نکل کر ایسی تیزی سے آئی جیسے کسی توپ سے گولہ فائر ہوا ہو۔ ہم اس سے گھبرائے تو ضرور لیکن زیر لب "جل تو جلال تو آئی بلا ٹال تو" کا ورد کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے پوری طاقت سے بلے کو گھما دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں محسوس ہوا جیسے زمین نے ہمیں گلے لگا لیا ہو اور ساتھ ہی ہمیں دن میں تارے نظر آنے لگے۔ لیکن جلد ہی ہمیں ہوش آگیا اور اصل صورت حال معلوم ہو گئی۔ اس باؤلر کی گیند کو ہم آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے اپنے بلے پر تو نہ لے سکے البتہ گیند پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے ہیلمٹ سے ٹکرائی اور ہم توازن برقرار نہ رکھ سکے اور چاروں شانے چت گر پڑے۔ ہیلمٹ اتر کر دور جا پڑا۔ یہ ہماری خوش قسمتی سمجھئے یا باؤلر کی بد قسمتی کہ وکٹوں سے ہمارا فاصلہ چند انچ کا تھا۔ اگر وکٹوں سے ٹکرا جاتے تو ہٹ وکٹ آؤٹ ہو جاتے۔ چناں چہ اس بال بال بچ جانے پر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر دوبارہ کھیلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حال آں کہ ہمارے سر میں درد ہو رہا تھا۔ باؤلر نے دوسری گیند کرائی۔ ہماری دور بین آنکھوں نے محسوس کیا کہ گیند ذرا اٹھ کر آرہی ہے کہیں باؤنسر ہی نہ ہو۔ چناں چہ ہم نے اس گیند کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور وکٹوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ اچانک ہمیں پشت پر شدید درد کا احساس ہوا۔ ہم نے جلدی سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ گیند ہماری پشت کو بوسہ دے کر ہمارے قدموں میں گری پڑی تھی۔ تب ہم نے محسوس کیا کہ ہم نے بیٹھ جانے کا غلط فیصلہ کیا ہے' گیند ضرورت سے زیادہ نہیں اچھلی۔

تو جناب اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہم نے یہ سب کچھ صبر سے برداشت کیا اور تیسری گیند کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کرنے لگے' یا اللہ اس ظالم فاسٹ باؤلر کو ہدایت دے کہ گیندیں آہستہ کرے۔ لیکن خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اگلی گیند کو بھی ہم نہ سمجھ سکے لیکن گیند اب تک ہمیں سمجھ چکی تھی۔ گیند جو آئی سیدھی ہمارے کندھے کو لگی اور رد عمل کے طور پر بلا ہمارے ہاتھ سے نکل کر نیچے جا پڑا اور ہم کندھا پکڑ کر رہ گئے۔ لیکن ہماری غیرت کو جوش اس وقت آیا جب مخالف ٹیم کے کھلاڑی ہماری حالت دیکھ کر ہنسنے لگے۔ چناں چہ ہم نے اپنی بے عزتی برداشت نہ کی اور کندھے کو چھوڑ کر بلے کو پکڑ لیا اور اگلی گیند کا انتظار کرنے لگے۔

خیر اگلی دو گیندوں نے ہماری حالت پر رحم کھایا اور بغیر کسی پس و پیش کے وکٹ کیپر کا رخ کیا۔ اب اوور کی آخری گیند پھینکی جانی تھی اور ہم دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اس فاسٹ بولر سے چھٹکارا مل جائے گا' اس کے باوجود کہ ہمارے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' ادھر رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس نے ہمیں مزید بے عزتی سے بچا لیا۔ ہوا کچھ یوں کہ آخری گیند کو بھی ہم نے نہ کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ گیند کو چھوڑ کر خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے آسمان کی جانب دیکھا لیکن فوراً ہمیں ماحول میں کچھ گڑ بڑ کا احساس ہوا۔ نیچے دیکھا تو تماشائیوں کا شور ایمپائر کی فضا میں اٹھی ہوئی انگلی اور کھلاڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آئے۔ پھر مڑ کر وکٹوں کی جانب دیکھا تو وکٹیں اکھڑ کر دور گری پڑی تھیں۔ اب ہم فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ گیند وکٹوں سے دور ہے لیکن یہ محض ہماری نظروں کا دھوکا تھا۔ گیند سیدھی وکٹوں کو جا کر لگی تھی۔ چناں چہ اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہم تھکے قدموں سے پویلین کی جانب روانہ ہوئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہمیں وہ زخم بالکل نہیں بھولے جو فاسٹ باؤلر کی گیندوں سے ہمیں لگے تھے۔ ہم نے اسی دن کرکٹ سے توبہ کر لی (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

چچا حیرت نے بچت کی

محمد ادریس قریشی

رات کے دو بج کر تیرہ منٹ پر چچا حیرت نے ایک زور دار چیخ ماری "آ گئی..... آ گئی"۔

ان کی بیگم ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں "کیا آ گئی! خواب میں کوئی چڑیل دیکھ لی ہے کیا؟"

"نہیں بیگم نہیں! پیسے بچانے کی ترکیب ذہن میں آ گئی ہے۔ سنو' میں نے سوچا ہے کہ صبح ہی ہم تمہارے لاہور والے بھائی کے گھر چلتے ہیں اور کم از کم پندرہ بیس دن وہاں رہتے ہیں۔ اس کے بعد لاہور میں اور بھی چھوٹے موٹے رشتہ دار ہیں۔ ایک آدھ دن ان سب کے گھر باری باری رہیں گے۔ مزے آ جائیں گے مزے' خوب کھانے کو ملے گا' حیرت ہے یہ ترکیب پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی"۔

بیگم نے منہ بنا کر کہا "پیسے بچانے والی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں' یہ ہے کہ اس بہانے بھائی جان شوکت سے ملاقات ہو جائے گی"۔

بس پھر کیا تھا۔ اگلے دن صبح سے ہی لاہور جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چچا حیرت کے ہاں کوئی اولاد تو تھی نہیں' بس دونوں میاں بیوی تھے۔ انہوں نے اپنے کپڑے ایک بیگ میں رکھ لیے۔ چچا حیرت نے کہا "ہم جا تو رہے ہیں لیکن ہماری مرغیوں کا کیا بنے گا؟"

"ہاں! یہ تو ہے" بیگم نے سر ہلایا۔

ان کے پاس دس مرغیاں اور دو مرغ تھے۔ چچا نے کہا "کوئی بات نہیں' میں اپنے پڑوسی دینے سے بات کرتا ہوں وہ مرغیاں سنبھالے گا اور انہیں دانہ دنکا ڈال دیا کرے گا"۔

چچا نے دینے سے بات کی تو وہ بولا "بھئی چچا! تمہاری مرغیاں تو میں سنبھال لوں گا لیکن تمہارے دونوں مرغ بہت خطرناک ہیں۔ ٹھونگے مار کر کہیں میرے بچوں کو زخمی نہ کر دیں۔ یہ تو مجھ سے نہیں سنبھالے جائیں گے"۔

چچا نے بے فکری سے کہا "چلو دو مرغوں کا کیا ہے۔ انہیں ہم اپنے ساتھ ہی لاہور لے جائیں گے۔ ویسے بھی ہم نے وہاں کون سا زیادہ عرصہ رہنا ہے۔ پندرہ بیس دنوں کی تو بات ہے"۔

اسی روز سہ پہر کے وقت چچا حیرت کندھے سے بیگ لٹکائے' دونوں بغلوں میں مرغ دابے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ان کی بیگم برقعہ اوڑھے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھیں۔ چچا بولے بیگم "خوب بچت ہو گی' مہینا بھر دوسروں کے گھر پڑے رہیں گے۔ مزا آ جائے گا مزا"۔

بیگم نے کہا "اتنی کنجوس بھی اچھی نہیں ہوتی لیکن خیر ہے میرے بھائی کو ہم دو افراد کو کھلا پلا کر کوئی فرق نہیں پڑے گا"۔

ریلوے اسٹیشن کی ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ چچا نے کہا "اے لو بیگم' خواتین کی کھڑکی پر رش کم ہے' میرا خیال ہے کہ تم ٹکٹ خرید لاؤ جا کر" انہوں نے بیگ اور

مرغ نیچے رکھے اور بیگم کو بٹوے سے روپے نکال کر دیئے۔ وہ عورتوں کی لائن میں لگ گئیں۔ چچا حیرت نیچے بیٹھ کر مرغوں کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ "لو بھئی مرغو! حیرت ہے تم کتنے خوش قسمت ہو' آج ریل گاڑی میں بیٹھ کر لاہور جا رہے ہو"۔

بیگم نے ٹکٹ لا کر چچا کے حوالے کر دیئے تو وہ پلیٹ فارم پر آ پہنچے۔ بیگ چچا نے بیگم کو پکڑایا اور دونوں مرغے بغل میں دابے پلیٹ فارم کے کنارے پر کھڑے ہو کر گاڑی آنے کی سمت میں دیکھنے لگے۔ "حیرت ہے گاڑی ابھی تک نہیں آئی"۔

آخر گاڑی دھڑ دھڑاتی ہوئی آ گئی۔ چچا پلیٹ فارم کے کنارے پر کھڑے تھے۔ ریل گاڑی ان کے بالکل قریب سے گزری تو مرغ خوف کے مارے پھڑ پھڑائے اور ان کی بغل سے نکل کر پلیٹ فارم پر بھاگ نکلے "ارے ارے حیرت ہے" چچا مرغوں کے پیچھے لپکے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے مرغ پکڑے۔ اتنی دیر میں ریل کے گارڈ نے دوبارہ سیٹی بجا کر گاڑی کی روانگی کا اشارہ دے دیا تھا۔ بیگم نے برقعے کا ایک پلو اوپر اٹھا کر کہا "ان نگوڑ مارے مرغوں کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟"

"چلو کوئی بات نہیں' جلدی سے آؤ' گاڑی چل نہ پڑے"۔

دونوں نے بھاگم بھاگ ایک ڈبے میں قدم رکھا اور گاڑی چل پڑی۔ کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔

"لو بھئی بیگم' کھڑے کھڑے سفر کرو۔ گاڑی میں تو رش ہے بہت" چچا ہنسے۔

آمنے سامنے والی سیٹوں پر دو نوجوان لڑکے بیٹھے تھے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "انکل آپ بزرگ ہیں' یہاں بیٹھ جائیں' ہم تو کھڑے ہو کر بھی جا سکتے ہیں"۔

چچا نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سیٹوں کے قریب ہی ایک خالی برتھ پر کپڑوں والا بیگ رکھ دیا اور دونوں مرغ بھی اس کے پاس بٹھا دیئے۔ پھر وہ اور ان کی بیگم سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ بیگم نے کہا "مرغوں کی کم از کم ٹانگیں تو کسی رسی سے باندھ لینی چاہئیں تھیں۔ اگر یہ دوبارہ بھاگ اٹھے تو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا۔ یہ میرے پالے ہوئے مرغے ہیں۔ وہ تو گاڑی کے دھوم دھڑکے سے خوف زدہ ہو گئے تھے بے چارے' ورنہ تو ان کی شرافت کی مثالیں دی جا سکتی ہیں"۔

چند لمحے گزر گئے چچا کھڑکی سے باہر کے نظاروں میں گم ہو گئے اور اس وقت چونکے جب ان کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ چچا نے اوپر دیکھا تو ٹکٹ چیکر کی صورت دکھائی دی۔

"ٹکٹ دکھائیں جناب"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں" چچا نے جیب میں ہاتھ ڈالا "ٹکٹ آپ کو نہیں دکھائیں گے تو اور کس کو دکھائیں گے' ارے اس میں نہیں ہیں' حیرت ہے کمال ہے۔ ہاں ہاں اس میں ہوں گے"۔ انہوں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "بغیر ٹکٹ سفر کرنا تو بہت غلط حرکت ہوتی ہے جناب۔ ہم نے لائن میں لگ کر تو ٹکٹ لیے ہیں۔ وہ بھی میری بیگم ساتھ تھیں ورنہ میری تو گھنٹا بھر باری نہ آتی جناب۔ ہاں تو ٹکٹ یہ رہے' ارے! ٹکٹ کہاں گئے بھلا' حیرت ہے کمال ہے" چچا نے کھڑے ہو کر اپنی جیبیں جھاڑ ڈالیں اور بٹوا ٹٹول ڈالا۔

"ہوں! ٹکٹ آپ کے پاس ہیں نہیں اور باتیں بنائے جا رہے ہیں" ٹکٹ چیکر نے ان کا مذاق اڑایا۔

"ارے صاحب! قسم لے لیں' لاہور کے دو عدد ٹکٹ تو ہم نے خریدے تھے مگر نہ جانے کہاں چلے گئے' حیرت ہے سخت حیرت" چچا نے ہونقوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

اسی وقت ایک مرغ نے برتھ پر سے چھلانگ لگائی اور ٹکٹ چیکر کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ چچا نے گھبرا کر مرغ کو ہاتھ مارا "ہٹ ہٹ بد تمیز! صاحب کے سر پر آ چڑھے ہو"۔

ہاتھ جو مارنا تھا مرغ کو دکر دوبارہ برتھ پر چڑھ گیا اور ٹکٹ چیکر کی ٹوپی نیچے جا پڑی۔

چچا اور بھی زیادہ بوکھلا گئے۔ انہوں نے جلدی سے جھک کر ٹوپی اٹھائی اور اسے جھاڑتے ہوئے بولے "مم..... معافی چاہتا ہوں جناب' یہ لیں اپنی ٹوپی"۔

ٹکٹ چیکر کی آنکھیں ایک لمحے کو مارے غصے کے سرخ ہو گئیں پھر اس نے ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا "ٹکٹ نہیں ہیں بڑے میاں تو رقم نکالو لاہور کے دو ٹکٹوں کے جرمانے سمیت پانچ سو پچاس روپے دو"۔

چچا نے بٹوے سے رقم نکال کر دینے کو غنیمت سمجھا اور ٹکٹ چیکر سے رسید حاصل کر لی۔

بیگم نے منہ بنا کر کہا "اور کر لو بچت"۔

چچا جل کر بولے "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تمہیں بس یا ویگن کے سفر میں الٹیاں لگ جاتی ہیں۔ مجبوراً ریل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ لگتا ہے جب میں پلیٹ فارم پر مرغوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا' اس وقت ٹکٹ جیب سے نکل کر کہیں گر پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ بٹوا تو محفوظ رہا' کوئی بات نہیں ہم تمہارے بھائی کے ہاں پانچ دن زیادہ رہ لیں گے' کسر پوری ہو جائے گی"۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتر کر وہ شوکت صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے۔ ان کا گھر ریلوے روڈ پر ہی تھا اور زیادہ دور نہیں تھا۔ ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ چچا نے مرغ صحن میں چھوڑ دیئے اور گھر میں موجود بچوں سے بولے "لو بھئی! ان مرغوں سے کھیلو اور انہیں روٹی کے ٹکڑے بھی ڈالو ہم ذرا آرام کر لیں"۔

چچا اور ان کی بیگم سکنجبین پی کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ چچا تو جلد ہی گہری نیند میں کھو گئے۔ پھر رات کے کھانے کے لیے انہیں اٹھا دیا گیا۔ چچا نے مزے دار قورمہ ڈٹ کر کھایا اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "ارے بھئی! ہمارے مرغے کسی دڑبے میں بند کر دینا"۔

"چچا' کون سے مرغے؟" شوکت صاحب کی بیوی بولی۔

"ارے وہی جو ہم اپنے ساتھ لائے ہیں" چچا نے آنکھیں گھمائیں۔

"مگر انہیں تو ہم اور آپ مل جل کر کھا چکے ہیں"۔

"کیا کہا' کھا چکے' اف میرے مرغے" چچا چیخے۔

"چچا' ہم تو سمجھے کہ آپ مرغ اسی لیے ساتھ لائے ہیں کہ انہیں کھا لیا جائے"۔

چچا کا موڈ سخت آف ہو گیا۔ نقصان پر نقصان ہوئے جا رہے تھے اور چلے تھے وہ بچت کرنے۔

رات چچا نے بڑی مشکل سے کاٹی۔ خواب میں انہیں مرغے نظر آتے رہے۔ صبح اٹھتے ہی انہوں نے بیگ اٹھایا اور

بولے "بیگم بس چلو ہم یہاں نہیں رہتے"۔

"لیکن کیوں ارات ہی تو ہم یہاں پہنچے ہیں"۔

"بس تم آجاؤ' ہم غصے میں ہیں اور تم جانتی ہو کہ کبھی کبھار ہمیں غصہ بھی آجایا کرتا ہے"۔ چچا نے آنکھیں نکالیں۔

شوکت صاحب اور ان کی بیگم نے انہیں بہت روکا' منت سماجت کی مگر چچا نہ مانے اور اپنی بیگم کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ باہر آکر چچا بولے "تمہارا ایک رشتے کا بھائی رشید بھی تو یہاں رہتا ہے اس کے گھر چل کر کچھ دن رہتے ہیں' ناشتا بھی وہیں کریں گے"۔

بیگم چاروناچار ان کے ساتھ چل پڑیں۔ چند گلیوں کے فاصلے پر جاکر انہوں نے رشید صاحب کے گھر کی بیل بجادی۔ ان کے بچے نے دروازہ کھولا اور بولا "ارے آپ' اندر تشریف لائیے"۔

رشید اور بیگم رشید بولے "ارے بھئی آپ صبح صبح آئے' بڑی خوشی ہوئی' کون سی گاڑی سے آئے؟"

چچا کی بیگم نے کہا "بس کیا بتائیں بھائی صاحب! ارات شوکت بھائی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ صبح ہی میرے میاں کو آپ

کے ہاتھ آنے کی سوجھ گئی"۔

چچا نے کہا "بھائی رشید! ابھی تو ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا' مجھے خیال آیا کہ آپ کے ہاں چلنا چاہیے"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" وہ بولے۔

چچا حیرت نے قمیص اتاری اور ایک کمرے میں کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے بولے "گرمی بھی تو بہت ہے ستمبر کا مہینا سڑی ہوئی گرمی کا ہوتا ہے"۔

چچا اپنی میلی سی بنیان کے ساتھ صحن میں آبیٹھے اور فرشی پنکھے کی ہوا سے محظوظ ہونے لگے۔ پندرہ منٹ کے بعد ان کے سامنے گرما گرم حلوا پوریاں اور دہی کی لسی کے لپٹ دار گلاس موجود تھے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر چچا بولے "بہت شکریہ بھائی صاحب! ہم آپ کے ہاں چند روز رہیں گے۔ آخر آپ ہمارے بھائی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہنا چاہیے"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں کیوں نہیں"۔ رشید صاحب بولے۔ پھر انہوں نے اپنے لڑکے سے کہا "گڈو! ذرا میرے بٹوے سے پیسے لے کر برف تو لانا"۔

گڈو نے تیز آواز میں کہا "آپ کے بٹوے میں تو پہلے ہی صرف دس روپے تھے باقی پیسے ان انکل کے بٹوے سے نکال کر تو میں ناشتے کا سامان لایا ہوں"۔

"کیا کہا' میرے بٹوے سے" چچا چیخے۔ انہوں نے لپک کر اپنی قمیص کھونٹی سے اتاری۔ اس میں سے بٹوا نکال کر کھولا تو ایک 50 کا نوٹ غائب پایا۔ چچا نے قمیص پہن لی اور بولے "اچھا بھائی رشید' ہم دوسرے رشتے داروں سے مل لیں' پھر قسمت میں ہوا تو ملیں گے' خدا حافظ"۔ چچا نے بیگ اٹھایا اور گھر سے باہر نکل آئے۔ ان کی بیگم کو کچھ کہنے سننے کی تاب نہ ہوئی۔ وہ بھی ان کے پیچھے نکل آئیں۔

"بس بیگم' بہت بچت ہو گئی' صرف واپسی کا کرایہ رہ گیا ہے۔ عزت اسی میں ہے کہ گھر واپس چلیں" چچا حیرت کندھے سے بیگ لٹکائے ہوئے' منہ لٹکائے ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں تھے۔

آیئے مسکرائیں

ایک پروفیسر جو کہ تحقیق کے ماہر تھے ایک دن یونی ورسٹی سے گھر آئے اور بیگم سے پوچھا۔ "کیا پکا ہے آج"

گھر میں کھانے کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے بیگم جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے غصے سے کہا "خاک پکایا ہے"

محقق پروفیسر نے لفظ خاک سے کھانے کا تعلق ڈھونڈتے ہوئے کہا۔ "خاک کو اگر الٹا پڑھو تو کاخ بنتا ہے۔ کاخ فارسی میں محل کو کہتے ہیں، محل کو الٹا پڑھو تو لحم بنتا ہے اور لحم عربی میں گوشت کو کہتے ہیں۔ تو بیگم صاحبہ بہت خوب یعنی آج آپ نے گوشت پکایا ہے"

(محمد عبدالحنان قادری ساہی وال)

"روئے زمین پر جتنے بھی انسان ہیں سب آدم و حوا کی اولاد ہیں"

استاد نے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم سب انسان ہیں اور ہماری نسل آدم و حوا سے چلی آ رہی ہے"۔

"لیکن سر! میرے دادا جان تو کہتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے انسان بندر تھا"۔ ایک بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ بے وقوف!" استاد نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "میں بچوں کو تمہارے خاندان کے بارے میں نہیں بتا رہا ہوں" (سدرہ ارشد دینہ)

ٹی وی پر ایک دیہاتی کا انٹرویو ہو رہا تھا۔

"جی ہاں میں بار بار یہی کہوں گا ہمارے گاؤں والوں کی صحت بہت اچھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پندرہ برسوں میں صرف ایک آدمی مرا"۔

"بہت خوب! کیا آپ بتائیں گے کہ وہ بدنصیب کون تھا؟ اور اس کی موت کس مرض سے ہوئی؟"

دیہاتی بولا: وہ ہمارے گاؤں کا ڈاکٹر تھا اور اس کی موت فاقوں سے ہوئی (مرزا مبشر حسین، شاہ کوٹ)

مالک: تم نوکری کیوں چھوڑ رہے ہو؟

نوکر: اس لیے جناب کہ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔

مالک: مگر میں نے تو گھر کی ساری چابیاں تمہیں دی ہیں۔

نوکر: مگر ان میں تجوری کی چابی نہیں ہے

(عمرانہ ناز، وصال فاروق راول پنڈی)

استاد (شاگرد سے): ثابت کرو کہ گرمیوں میں چیزیں پھیلتی اور سردیوں میں سکڑتی ہیں۔

شاگرد: جناب! گرمیوں میں چھٹیاں پھیل کر لمبی ہو جاتی ہیں یعنی 2 ماہ کی اور سردیوں میں سکڑ کر 15 دن کی رہ جاتی ہیں (ثمین سحر جھنگ)

ایک شخص رات کو بارہ بجے مطب پہنچا اور دروازے پر دستک دے کر ڈاکٹر سے کہنے لگا۔ "ڈاکٹر! ڈاکٹر! ایک کتے نے مجھے کاٹ لیا ہے"۔

ڈاکٹر غصے سے بولا "آپ کو معلوم ہے کہ میرے مطب کا وقت 6 بجے سے 9 بجے تک ہے"۔

وہ شخص کراہتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو معلوم ہے مگر کتے کو معلوم نہیں تھا۔ اس نے مجھے ساڑھے گیارہ بجے کاٹ لیا" (محمد احمد شرق پور)

خون آلود رومال

نجمہ معراج

فہیم اور راشد ہم جماعت تھے اور آپس میں گہرے دوست تھے۔ پڑھ لکھ کر فہیم تو لاہور میں ہی ملازم ہو گیا جب کہ راشد کو ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور شادی کے بعد وہ وہاں ہی رہائش پذیر ہو گیا۔ پہلے تو وہ دونوں ایک دوسرے سے اکثر ملتے رہتے تھے لیکن اب ایک تو دونوں کے درمیان فاصلہ کافی تھا' دوسرے دونوں ہی کی اپنی اپنی گھریلو اور ملازمت کی مصروفیات بھی تھیں جن کی وجہ سے ان کی ملاقات نہ ہو پاتی۔ البتہ دونوں کا ایک دوسرے سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوتا رہتا تھا۔

ایک دن گرمیوں کی کافی گرم رات تھی۔ رات کے تقریباً دس سوا دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ فہیم نے فون اٹھایا۔ یہ اس کے گہرے دوست اور سابقہ ہم جماعت راشد کا فون تھا۔ سلام دعا اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد راشد نے فہیم سے کہا "یار بہت دیر ہو چکی ہے ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے اور گرمی بھی بہت ہے۔ اگر کچھ دنوں کے لیے آ جاؤ تو ملاقات بھی ہو جائے گی اور مری کی سیر وغیرہ بھی"۔

فہیم نے فوراً ہی راشد کی بات مان لی۔ کیوں کہ وہ بھی روزانہ ایک ہی طرح کے کام کرتے ہوئے بوریت محسوس کر رہا تھا۔ صبح صبح اٹھنا پھر دفتر جانا اور سارا دن دفتر کا کام اور گھر آ کر بچوں کو پڑھانا' گھر کا سودا سلف لانا اس کے روزانہ کے معمولات میں کئی سالوں سے شامل تھا۔ فہیم تو پہلے ہی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر ریسٹ یا سیر سپاٹا ہو جائے۔ لہٰذا وعدے کے مطابق کچھ ہی دنوں کے بعد فہیم راشد کے ہاں پہنچ گیا۔

راشد فہیم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے اپنے بچپن اور اسکول دور کی باتیں کیں۔ اچھے ٹیچرز اور اچھے دوستوں کا تذکرہ بھی ہوا۔ بچپن سے اب تک کی زندگی دونوں کے ذہنوں میں فلم کی طرح گھوم گئی تھی۔ فہیم تو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اب سونے کے لیے لیٹ گیا مگر راشد سے نیند کوسوں دور تھی۔

راشد نے شیشے کے ایک شوکیس' جو دیوار میں بہت ہی خوب صورتی سے بنا ہوا تھا' میں بہت سے شوپیس سجا رکھے تھے۔ فہیم کی نظر پڑی تو وہ اٹھ کر شوکیس کے پاس چلا گیا۔ فہیم اب ان سب کو بڑے غور اور دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک خون آلود رومال پر پڑی۔ مارے حیرت کے اچانک اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ 'شوپیسوں میں بھلا خون آلود رومال کا کیا کام؟"

وہ کچھ دیر حیران پریشان اس کو دیکھتا رہا پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ صبح ناشتے کے بعد وہ فیصل مسجد' راول ڈیم' امام بری اور دامن کوہ کی سیر کو نکل گئے۔ واپس آ کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ راشد دوپہر کا کھانا لے کر آ گیا۔ مگر فہیم کے ذہن میں وہ خون آلود رومال ابھی تک گھوم رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے کافی فکر مند سا نظر آ رہا تھا۔

راشد کہنے لگا "یار' اس قدر حیران پریشان کیوں کھڑے ہو' آؤ بیٹھو اور کھانا کھاؤ"۔

فہیم بولا "راشد یار' کھانا تو میں بعد میں کھاؤں گا' پہلے تم

یہ بتاؤ کہ یہ شو کیس میں خون آلود رومال کا کیا کام ہے؟ اور یہ کہاں سے آیا ہے؟ آپ کے سب شو پیس بہت اچھے ہیں مگر یہ خون آلود رومال؟"

اس کے جواب میں راشد بولا "آؤ بیٹھو فہیم' میں آپ کو خون آلود رومال کے بارے میں بتاتا ہوں۔ میرے لیے یہ سب سے قیمتی اور اچھا شو پیس ہے۔ چند سال پہلے کی بات ہے' میں دفتر جانے کے لیے حسب معمول دیر سے تیار ہوا۔ جلدی جلدی بس اسٹاپ پر پہنچا تو ہر وین دفتر یا اسکول جانے والوں سے کھچا کھچ بھری آ رہی تھی۔ جو تھوڑی بہت لٹکنے کی جگہ ملتی لوگ جلدی سے لٹک جاتے۔ ہر ایک کو اسکول دفتر یا کالج وقت پر پہنچنے کی جلدی تھی۔

میں نے بھی ایک کھچا کھچ بھری وین کے پائیدان پر پاؤں رکھے اور وین کی چھت کی بڑھی ہوئی سلاخ کو ہاتھ ڈال لیا۔ دفتر کافی دور تھا۔ ابھی وین نے آدھا رستہ بھی نہ طے کیا ہو گا کہ یک دم ایک جھٹکا سا لگا اور میرا ہاتھ اوپر سے چھوٹ گیا۔ یوں میں سیدھا سڑک پر جا گرا۔ گرتے ہی میرا سر سڑک کے ساتھ زور سے ٹکرایا اور فوارے کی طرح خون نکلنا شروع ہو گیا۔ میرے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ کوئی مجھے پانی پلانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا' کوئی مجھے سائے میں لے کر جا رہا تھا تو کوئی کھڑا میری چوٹ پہ افسوس کر رہا تھا۔ پاس کھڑی ایک عورت کہہ رہی تھی "گھر سے بے چارہ اچھا بھلا آیا ہو گا"۔ دوسری کہنے لگی "جلدی میں یہ مرد تو وین کے باہر ہی لٹک جاتے ہیں' ایک دو ویگنیں مس کر لیا کریں تو ان کو بھی اندر جگہ مل جائے اور ایسے چوٹیں نہ لگیں"۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر شخص نورانی چہرہ' لمبی ڈاڑھی اور سر پر جالی دار ٹوپی' ڈاڑھی کے بال آدھے سفید اور آدھے سیاہ تھے' اس نے میرے پاس آ کر گاڑی روکی۔ پھر وہ گاڑی میں سے تیزی سے نکلا اور اپنی جیب میں سے رومال نکال کر کس کے میری چوٹ والی جگہ پر باندھ دیا اور ایک اور آدمی کی مدد سے جو میرے پاس ہی کھڑا مجھے پانی پلا رہا تھا' اٹھا کر گاڑی میں بٹھا لیا۔ یوں اس نے مجھے ہسپتال کی ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا۔ میں ہوش میں تھا لیکن اتنی ہوش نہ تھی کہ اس محسن کا شکریہ ادا کر سکتا اور جب مجھے اچھی طرح ہوش آیا تو میری نظروں نے فوراً اس محسن کو ارد گرد ڈھونڈنا شروع کیا۔ اتنے میں سامنے کھڑے ڈاکٹر صاحب نے کہا "تم یقیناً اس محسن کو ڈھونڈ رہے ہو جو آپ کو ہسپتال چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ تو چلا گیا ہے لیکن اس نے آپ پر بہت بڑا احسان کیا۔ اگر وہ آپ کو بروقت ہسپتال نہ پہنچاتا تو خون بہنے سے آپ کی جان بھی جا سکتی تھی"۔

ڈاکٹر صاحب نے تو یہ کہنے کے بعد مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا۔ جب کہ میں گھر واپس جانے کے لیے بیڈ پر سے نیچے اتر رہا تھا تو بیڈ کے پاس پڑے ہوئے کوڑے دان میں مجھے ایک خون آلود رومال نظر آیا۔ یہ وہی رومال تھا جو اس محسن نے میرے سر پر باندھا تھا۔ میں نے وہ رومال جلدی سے اٹھایا اور نہایت عقیدت کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لیا اور گھر آ گیا۔ گھر آ کر میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کاش وہ میرا محسن مجھے مل جائے تو میں اس کا بے حد شکریہ ادا کروں لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ اس وقت سے اب تک میں یہ رومال سنبھالے ہوئے ہوں اور نہ تا قیامت اسے کھونا نہیں چاہتا ہوں۔ یہ مجھے اپنے محسن کا احسان یاد دلاتا ہے اور میں اسے دیکھ کر اس کو اچھے لفظوں میں یاد کرتا رہتا ہوں اور دعائیں دیتا رہتا ہوں"۔

فہیم بولا "واقعی راشد آپ نے اس رومال کو جس جگہ رکھا ہے یہی اس کا مقام ہے۔ کیوں کہ ہمیں کبھی بھی کسی محسن کے احسان کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اسے کچھ بدلے میں دے نہ سکیں تو کم از کم دعائیں تو ضرور ہی دیتے رہنا چاہیے"۔

فہیم کی پریشانی اب دور ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اب دونوں دوست دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے مری' خانس پور' نتھیا گلی' پتریاٹہ اور ایوبیہ جانے اور خوب سیر کرنے کا پروگرام بنایا اور اب وہ اپنا مختصر سا سامان لے کر اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

کارٹون کہانی

نرالے میاں نے ربوٹ بنایا

شاہد ریاض شاہد

ایک دن نرالے میاں نے ایک ربوٹ تیار کیا جو چور کو پکڑ لیتا تھا

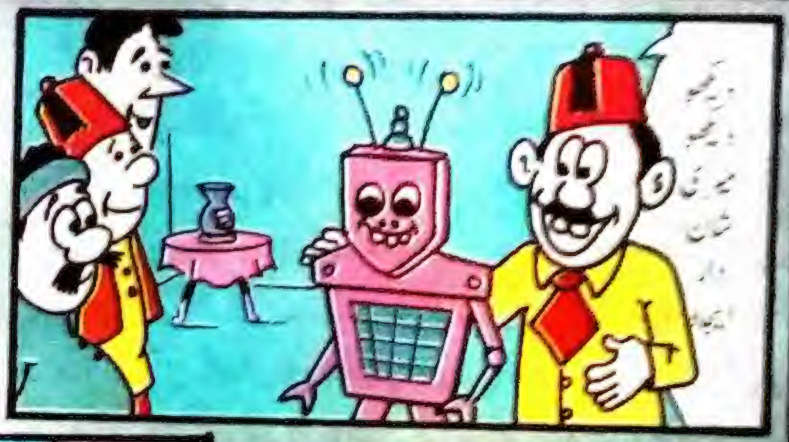

پھر انہوں نے اپنے اس ربوٹ کے کام کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا

چلو اسی گل دان پر تجربہ کر کے دیکھتے ہیں

اس کے بعد نرالے میاں نے گل دان میز پر رکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ سوچنے لگے

اس کے بعد نرالے میاں
نے گل دان ملک صاحب
کو دیا اور ربوٹ کا کنٹرول
گنجو میاں کو دے کر کہا
گنجو تم بٹن دباؤ' دیکھنا یہ کس طرح ملک کو دبوچے گا۔
ہائیں ہائیں یہ
کیا؟ یہ کیا؟
میاں کو گردن سے پکڑ لیا۔ باقی
سب انھیں چھڑانے کے لیے
پیچھے بھاگے
واہ نرالے میاں آپ کی
ایجاد بھی نرالی ہے
دراصل ہوا یہ کہ نرالے میاں نے
ربوٹ کا سنسر گل دان میں ڈالنے
کے بجائے جیب میں ڈال لیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ابو نے اپنا دایاں پاؤں جوتے میں ڈالا..... پھر بایاں ڈالنا چاہا۔ ان کا پاؤں فرش پر لگا۔ بائیں پاؤں کا جوتا وہاں نہیں تھا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ گھر میں چیزیں ادھر ادھر ہو جانا روز کا معمول تھا۔ منے میاں یہ کام بہت خوش اسلوبی سے کر دیا کرتے تھے۔ پہلے کمرے میں دیکھا' جوتا نظر نہ آیا۔ وہ اسی طرح ایک پاؤں جوتے میں ڈالے دوسرا پاؤں ننگا لیے کمرے سے نکلے۔ صحن میں نظر دوڑائی' جوتا وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے ہمارے کمرے میں آئے' جوتا وہاں بھی نہیں تھا۔ ان کی حیرت زدہ آواز ابھری :

"بب..... بیگم..... میرا ایک جوتا غائب ہے"۔

"آپ دفتر بھول آئے ہوں گے" امی جان کی آواز سنائی دی۔

"میں ایک جوتا کہہ رہا ہوں" انہوں نے منہ بنایا۔

"آپ کا مطلب ہے ابو! آپ دونوں جوتے دفتر میں بھول کر آسکتے ہیں" منے نے حیران ہو کر کہا۔

ابو کو ہنسی آگئی۔ ہم سب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"کیا ہوا ابو!" بھائی جان اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے بولے۔

"میرا ایک جوتا غائب ہے"۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے' منے میاں کا کان مڑوڑنا شروع کریں فوراً اگل دیں گے"۔ بھائی جان نے فوراً نیک مشورہ دیا۔

"جوتا اگل دیں گے" میں حیران ہو کر بولا۔

"نہیں..... یہ اگل دیں گے کہ انہوں نے جوتا کہاں چھپایا ہے"۔

"میں کیوں چھپاتا جوتا" منے میاں نے جلدی سے کہا۔

"اوہو! مجھے دیر ہو رہی ہے..... کل بھی میں پانچ منٹ لیٹ دفتر پہنچا تھا..... چیف آفیسر صاحب نے کھری کھری سنائی تھیں"۔

"آپ کا ایک جوتا کسی کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی بھلا..... وہ بھی دفتر کے وقت"۔

تب پھر جوتا کہاں ہے..... اس کے پاؤں تو نہیں تھے کہ کہیں سیر کرنے نکل گیا"۔

"اس کے پر بھی نہیں تھے کہ پھر سے اڑ گیا اور باغ میں کسی درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا..... ارے ہاں! ہم نے باغ میں تو دیکھا نہیں"۔ ابو بلند آواز میں بولے۔

اب سب کے سب باغ کی طرف دوڑے۔ ادھر دیکھا' ادھر دیکھا لیکن جوتے کا کہیں نام نشان نظر نہ آیا۔

"حیرت ہے..... اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا"۔

"ابو آپ میرے جوتے پہن کر چلے جائیں، ہم اطمینان سے آپ کا جوتا تلاش کرتے رہیں گے"۔ بھائی جان بولے۔

"یہ مشورہ بہت مناسب ہے" باجی نے فوراً کہا۔

"اچھی بات ہے"۔

اور وہ بھائی کے جوتے پہن کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے واقعی پورے اطمینان سے ان کا جوتا تلاش کیا لیکن پورے گھر میں جوتا کہیں نہ ملا۔ اب تو مارے حیرت کے سب کا برا حال ہو گیا۔

"کک..... کہیں ابو واقعی جوتا دفتر نہ بھول آئے ہوں"۔ میں بول اٹھا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا" بھائی نے مجھے گھورا۔ میں سہم گیا۔

اب سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور لگے سوچنے۔ ایسے میں امی جان کی آواز سنائی دی۔

"یوں سر جوڑ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں بنے گا"۔

"تب پھر کیا کریں"۔

"پورے محلے میں تلاش کرو۔ چار سو روپے کا لائے تھے آپ لوگوں کے ابو..... گویا وہ پورے دو سو کا ہے"۔

"جی نہیں..... پورے چار سو کا..... کیوں کہ اس کے بغیر دوسرا جوتا بھی بے کار ہے..... اور پھر بازار سے ایک جوتا نہیں ملتا کہ ابو جائیں گے اور اس کے ساتھ کا ایک جوتا اور لے آئیں گے"۔ باجی نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"لیکن امی جان، ہم آس پاس کے پڑوسیوں سے کہیں گے کیا"۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ کہ..... کہیں منے میاں ہمارے ابو کا ایک جوتا تو یہاں نہیں گرا گئے"۔

"بالکل ٹھیک، اس طرح تو واقعی یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے"۔

اور پھر ہماری ٹیم گھر سے نکل گئی۔ ہم نے ایک ایک پڑوسی کے دروازے پر دستک دی، ہر ایک سے سوال کیا۔

"معاف کیجئے جناب، ہمارے منے میاں ہمارے ابو کا ایک جوتا تو یہاں کہیں نہیں چھوڑ گئے"۔

ہر ایک نے ہمارا سوال سن کر حیرت ظاہر کی اور نفی میں سر ہلایا۔ ساتھ میں یہ قیمتی مشورہ بھی دیا۔

"مل جائے گا، آس پاس ہی ہو گا، ایک جوتا کوئی لے جا کر کیا کرے گا"۔

بات معقول تھی۔ اگر کسی کو جوتے چرانے کی ضرورت پیش آ گئی تھی تو دونوں چراتا..... نہ کہ ایک۔ ہم نے پورا محلہ چھان مارا، جوتے کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر گھر لوٹ آئے۔ امی جان تڑ سے بولیں:

"کیوں..... ملا جوتا"۔

"جی نہیں..... وہ شاید کہیں دور نکل گیا"۔

"حد ہو گئی..... جوتا جان دار چیز تو نہیں ہوتی کہ دور یا نزدیک جا سکے"۔

"اب آپ ہی بتائیں..... ہم کیا کریں۔ جوتے کو کہاں تلاش کریں"۔

"بس جو تم کر سکتے تھے کر لیا اب صبر کرو" امی جان نے تنگ آ کر کہا۔

شام کو ابو دفتر سے لوٹے تو پہلا سوال انہوں نے یہی کیا:

"جوتا مل گیا؟"

"جی نہیں، بالکل نہیں ملا" منے میاں نے فوراً کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو بھئی..... بالکل نہیں ملا..... یعنی وہ تھوڑا بہت مل سکتا تھا" ابو حیران ہو کر بولے۔

"اوہ جی نہیں..... میرا مطلب یہ نہیں تھا"۔

"پھر اب کیا کیا جائے"۔

"آپ نئے جوتے لے آئیں" منے میاں نے مشورہ دیا۔

"پورے چار سو کا تھا"۔ ابو نے آنکھیں نکالیں۔

"آپ ہی بتائیں، ہم اس کو کہاں تلاش کریں"۔

"اچھا ختم کرو، میں کل نیا لے آؤں گا"۔ وہ جھلا اٹھے۔

دوسرے دن ابو نیا جوتا لے آئے۔ اکلوتا جوتا اسٹور میں ایک طرف ڈال دیا گیا۔ کیوں کہ اب وہ کسی کام کا نہیں تھا۔

پھر اس بات کو کافی دن گزر گئے۔ ایک دن مجھے اسٹور میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ

احساس یہ تھا کہ دوسرا جوتا سٹور میں نہیں ہے۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ دوسرا جوتا بھی واقعی غائب تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ باہر نکل کر میں نے یہ بات سب کو بتائی۔

"اف مالک! یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے ایک جوتا غائب ہوا تھا' اب دوسرا ہو گیا"۔ امی جان پریشان ہو گئیں۔

"دیکھیں بھئی' پہلے بات تھی صرف ایک جوتے کی' میں صبر کر کے بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اب معاملہ ہو گیا دونوں جوتوں کا۔ لہٰذا اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا"۔

"سوال یہ ہے کہ کیا یہ کسی چور کا کام ہے؟ لیکن اگر یہ کام کسی چور کا ہے تو اس نے پہلے ایک جوتا کیوں اٹھایا۔ وہ پہلے ہی دونوں جوتے چرا سکتا تھا۔ بھلا اس سے کیا فرق پڑ جاتا"۔

"واقعی بہت الجھن کی بات ہے' اور اس کا کوئی جواب نہیں سوجھ رہا"۔

"مجھے جوتے سے زیادہ اس سوال کے جواب کی ضرورت ہے"۔ ابو بولے۔

ہم ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ امی جان ہم سے زیادہ پریشان تھیں' ان کا کہنا تھا' آج چار سو روپے کا جوتا گیا ہے کل کوئی ایک ہزار کی چیز جائے گی' پھر پانچ ہزار کی...... لہٰذا اس بارے میں سوچنا ہو گا۔ چور کو روکنا ہو گا۔

کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد بھی کسی کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی۔ آخر آہستہ آہستہ ہم دونوں جوتوں کو بھول گئے۔

ایک دن میری نظر ایک بھکاری پر پڑی۔ میں دھک سے رہ گیا۔ ابو کے دونوں جوتے اس کے دونوں پیروں میں تھے۔ اور وہ بہت درد بھرے انداز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غور سے جوتوں کو دیکھا۔ وہ وہی تھے جن میں سے پہلے ایک غائب ہوا تھا پھر دوسرا۔ میں نے کچھ سوچا اور اس سے بولا: "کھانا کھاؤ گے"۔

"بھوکا کیا چاہے' دو روٹی...... اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں...... یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"۔ بھکاری نے خوش ہو کر کہا۔

"اندر آ جائیں" میں نے کہا اور سے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گھر کے اندر آ گیا۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں منہ پر

دونوں ہاتھ رکھ کر کہا: "میں نے میدان مار لیا"۔

"لیکن کون سا میدان" منے میاں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جوتوں کا میدان"۔

"کیا کہا...... جوتوں کا میدان۔ اس میدان کا نام تو زندگی میں پہلی بار سنا ہے۔ تم نے کیسے مار لیا؟" ابو نے گھبرا کر کہا۔

"آپ سمجھے نہیں ابو' جوتوں کا میدان سے مراد ہے آپ کے گم شدہ جوتوں کا میدان"۔

"کیا کہا؟ گم شدہ جوتے' وہ والے؟"

"جی ہاں! وہ والے' ڈرائنگ روم میں ایک بھکاری ہے۔ اس کے دونوں پیروں میں' دونوں جوتے موجود ہیں"۔

"کیا کہا؟ کیا کہا؟ لیکن وہ ڈرائنگ روم میں کیوں بیٹھا ہے"۔ ابو نے بوکھلا کر کہا۔

"اسے میں نے بٹھایا ہے' کھانا کھلانے کے بہانے"۔

"حد ہو گئی' ایک تو اس نے ہمارے جوتے چرائے اوپر سے ہم اسے کھانا بھی کھلائیں"۔ امی جان بھنا اٹھیں۔

"اوہو بھئی' اب اس غریب سے جوتوں کی بات کرنے کی ضرورت نہیں' وہ ننگے پاؤں ہو گا بس لے گیا جوتے" ابو بولے۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیسے لے گیا؟ اس پر بھی تو غور کریں۔ پہلے ایک کیوں لے گیا؟ دونوں ایک ساتھ کیوں نہیں لے گیا"۔ امی جان نے برا سا منہ بنایا۔

"ہو گی کوئی اس کی مجبوری۔ شوکی، تم اسے کھانا کھلاؤ اور چلتا کرو"۔

"گویا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اس سے جوتوں کے بارے میں پوچھیں بھی نہ"۔

"نہیں بالکل نہیں، بری بات ہے، ایک جوڑا جوتوں کے لیے اب ہم اسے اس کی نظروں میں گرائیں، نہیں ہرگز نہیں، وہ بھی انسان ہے۔ بس اسے کھانا کھلا کر رخصت کر دو"۔ ابا جان نے جلدی جلدی کہا۔

"جی اچھا....."

پھر میں اور منے میاں کھانے کی ٹرے اور پانی کا جگ وغیرہ اٹھائے اندر داخل ہوئے تو اس کے چہرے پر بلا کی حیرت تھی۔

"کیا ہوا بھئی، خیر تو ہے۔ کیا آپ کو یہاں کوئی شیر نظر آگیا ہے"۔

"اس میں شک نہیں" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا مطلب؟ کس میں شک نہیں" میں بول اٹھا۔

"مجھے یہاں ایک عدد شیر نظر آگیا ہے۔ ویسے اس شیر سے آپ کا رشتہ کیا ہے۔ آپ نے اپنے گھر میں اس شیر کی تصویر کیوں لگا رکھی ہے"۔

"حد ہو گئی، ارے بھائی آپ کون سے شیر کی تصویر کی بات کر رہے ہیں، پتا بھی تو چلے"۔ منے میاں جھلا اٹھے۔

"یہ جو سامنے نظر آرہی ہے"۔ اس نے اگلی سے ہمارے ابو کی طرف اشارہ کیا۔

"حد ہو گئی، یہ شیر نہیں ہمارے ابو ہیں۔ آپ کی نظر تو کم زور نہیں"۔

"کیا آپ کو میری آنکھوں پر عینک نظر آرہی ہے"۔

"نہیں تو، خیر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کسی شیر کی نہیں ہمارے ابو کی تصویر ہے"۔ میں نے نرم آواز میں کہا۔

"لیکن یہ ہیں شیر، پہلے مجھے ایک دن ایک جوتا دے گئے، کچھ دنوں بعد دوسرا جوتا بھی دے گئے"

"کیا کہا..... کیا"۔ میں اور منے میاں چلا اٹھے۔

ہمارے چلانے کی آواز نے سب کو ہمارے گرد جمع کر دیا۔ اب جو میں نے بھکاری کی بات ان سب کو بتائی تو وہ ہم دونوں سے بھی زیادہ زور سے کیا کیا کرنے لگے۔ ادھر ابو عجیب کھسیانے انداز میں مسکرا رہے تھے۔

"آپ کو اس انداز میں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا"۔

"وہ، بھئی بس..... تمہاری امی کے ڈر سے..... میں نے سوچا..... یہ کئی دن تک مجھے پریشان کریں گی..... اب تم لوگ دیکھ ہی چکے ہو..... اس طرح یہ مجھے ایک لفظ نہیں کہہ سکیں..... اگر یہ حضرت اتفاق سے اس طرف نہ نکل آتے تو یہ راز راز ہی رہتا"۔

امی کی نظریں جھک گئیں۔ انہیں بات بے بات ابو کو ٹوکنا یاد آرہا تھا۔ ایسے میں ہم نے بھکاری صاحب کی آواز سنی:

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ، بہت پیٹ بھر کر کھایا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا" یہ واقعی ایک شیر کی تصویر ہے"۔

بلا عنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 ستمبر 2001ء

اگست 2001ء کے بلا عنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ 6 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

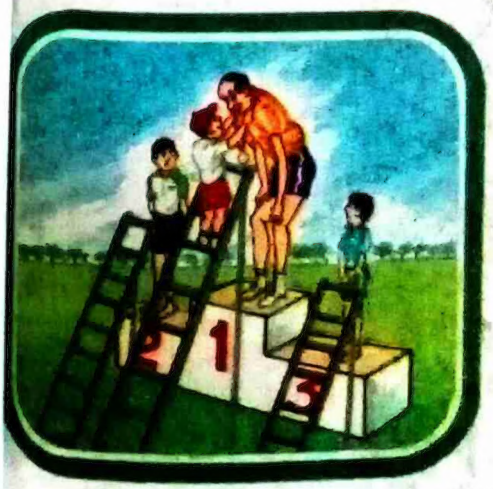

☆ کاشف رضا فریدی ساہی وال (گولڈ میڈل تمہارے لیے مصیبت ہمارے لیے، پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ سلمان سعید کراچی (اولمپک بچوں کے 'جیت ابو کی' دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ مدثر علی ملتان (میں تو سر فخر سے بلند کرنا چاہتا تھا آپ نے جھکا دیا' تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ رضوان اکرم فیصل آباد (پرائمری جماعت میں فرسٹ پوزیشن' چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ محمد سعد سلیم بہاول نگر (کاش مہمان خصوصی وکٹری اسٹینڈ پر اور کھلاڑی نیچے ہوتا' پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ طلحہ ارشد منڈی بہاء الدین (بیٹے کیا ابو گھر پہ نہیں تھے' چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

ہر قسم کے لذیذ اور خوش ذائقہ

پکوان

مُنوّر جہاں کا دسترخوان :	سستے اور پُرتکلف کھانے پکانے کی عام فہم ترکیبیں۔	Rs. 39.00
دیس دیس کے پکوان :	ایشیا، افریقہ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکا کے لذیذ پکوان۔	Rs. 30.00
صبیحہ کا دسترخوان :	کم فرصت خواتین کے لیے طرح طرح کے کھانے، پڈنگ، شربت، جام اور اچار۔	Rs. 39.00
چینی کھانے :	چینی کھانوں کے شائقین کے لیے لاجواب کتاب۔	Rs. 40.00
سبزیاں پکایئے :	سبزیاں پکانے کی ترکیبیں۔ یہ کتاب مُنوّر جہاں کے دسترخوان سے مُرتّب کی گئی ہے۔	Rs. 30.00
گوشت پکایئے، مچھلی پکایئے :	گوشت اور مچھلی کے ہر قسم کے پکوان۔ یہ کتاب بھی مُنوّر جہاں کے دسترخوان سے مُرتّب کی گئی ہے۔	Rs. 50.00
میٹھے پکوان :	حلوے، زردے، کھیر، سوّیاں، انگریزی پڈنگ اور دیسی مٹھائیاں بنانے کی آسان ترکیبیں۔	Rs. 50.00

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

صوفی گلزار احمد کی سدا بہار، سبق آموز کتابیں

دس نیکیاں — دس برائیاں — قیمت 24.00

دس احادیثِ مبارکہ — دس اولیائے کرامؒ — قیمت 30.00

دس جنتی صحابیؓ — دس مسلمان جغرافیہ دان — قیمت 24.00

دس مسلمان سائنس دان — دس مسلمان طبیب — قیمت 24.00

دس مسلمان حکمران — قیمت 24.00

دس مشاہیر اسلام — قیمت 24.00

ان کتابوں کو احادیثِ مبارکہ قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں بچوں کی تعمیرِ سیرت اور اسلامی مشاہیر کے عظیم کارناموں سے مکمل آگاہی کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا ہے اس سلسلے کی مزید کتابیں بھی جلد ہی آرہی ہیں۔ دس مسلمان سپہ سالار - دس مسلمان سیاح دس مسلمان مورخین - دس مسلمان خواتین - دس مسلمان شاعر دس مسلمان نثر نگار۔

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

FEROZSONS (Pvt.) LTD.
LAHORE-RAWALPINDI-KARACHI